آئینہ پرویزیت

حصہ اول

معتزلہ سے طلوع اسلام تک

مصنفہ:
عبدالرحمن کیلانی

ناشر:
مکتبۃ السلام وسن پورہ گلی نمبر ۲۰ لاہور

آئینۂ پرویزیت

حصہ اوّل

معتزلہ سے طلوعِ اسلام تک

مصنفہ:
عبدالرحمٰن کیلانی

فہرست ابواب:-

عجمی تصورات کی اسلام میں درآمد۔ انکار سنت کے اسباب۔ معتزلہ کے مخصوص عقائد و نظریات اور نتائج۔ منکرین حدیث کی سلسلہ وار تاریخ)

ناشر:
مکتبۃ السلام۔ وسن پورہ گلی نمبر ۲۰ لاہور

طبع اول	اکتوبر ۱۹۸۰ء
تعداد	ایک ہزار
طابع	سیون برادرز پریس ۲۰۔ اردو بازار۔ لاہور
ناشر	مکتبہ السلام وسن پورہ ۔ لاہور
قیمت	۱۲ روپے

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

قرآن سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں (۱) قلبِ سلیم اور عقلِ صحیح۔ اگر کوئی شخص انہی دو شرطوں کو ملحوظ رکھ کر یعنی خلوصِ نیت سے اور خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے تو وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقِ کار کو تسلیم کرنے اور اس کی اتباع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو آپ نے قرآنی احکام کی تعمیل کے دوران اختیار کر کے امتِ مسلمہ کو دکھلایا تھا۔ اس طریقِ کار کو قرآن نے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔ اور اس کی اتباع کو مسلمانوں کے لیئے تا قیامت واجب الاتباع قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کی اتباع کے بغیر قرآن پر عمل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ شرک کے بعد قرآن نے جتنا زور اطاعت و اتباعِ رسول اور اس کے ادب و احترام پر دیا ہے اتنا اور کسی بات پر نہیں دیا تو یہ بے جا بات نہ ہو گی۔

سنتِ رسول کی حجیت سے انکار کے فتنہ نے دوسری صدی میں سر اٹھایا تھا۔ میں اس طبقہ کے بہت سے لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انکارِ سنت کے بنیادی محرکات دو ہی چیزیں ہیں (۱) فلسفیانہ یا سائنٹیفک نظریات سے مرعوبیت اور (۲) اتباعِ ہوائے نفس۔ یعنی ایک مسلمان کی طرزِ بود و باش، اعمال و افعال اور اکتسابِ رزق پر سنتِ رسول جو پابندیاں عائد کرتی ہے ان سے فرار و گریز۔ اس دور میں بھی اس فتنہ کے بنیادی محرکات یہی دو باتیں تھیں اور آج بھی یہی دونوں باتیں ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں جب اس فتنہ نے جنم لیا تو علمائے امت نے اس کا بھرپور دفاع کیا۔ جن ائمہ کرام نے یہ فریضہ سرانجام دیا ان میں امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاری اور امام ابن قتیبہ کے نام بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس دور میں اس فتنہ انکارِ سنت یا اعتزال کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گئی جس کی وجہ سے یہ فتنہ تقریباً سوا سو سال زندہ رہا اور جب یہ سرپرستی ختم ہو گئی تو یہ فتنہ بھی آپ ہی اپنی موت مر گیا۔ اور اس کی موت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ سنتِ رسول کی حجیت سے انکار ایک ایسا نظریہ تھا جو اسلام کے مزاج سے بالکل لگا نہیں کھاتا تھا۔

موجودہ دور میں اس فتنہ کو اگرچہ کہیں بھی حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں۔ تاہم اس کی پذیرائی کے اور کئی اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ جب قرآن کے نام پر

نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ اور اسلام بیزار طبقہ کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام دراصل ان گنے چنے اصولِ قوانین اور احکام کا نام ہے۔ جو قر[illegible] تعبیر کا طریق کار، تو اس کے لیے ہر دور کے مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے دور کے علم[1] کے مطابق اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان احکام کی تاویل و تعبیر کر لیا کریں۔ پھر کچھ حضرات نے سنتِ رسول سے آزاد ہو کر اور لغت کے بنیادی معنوں سے فرار اور دور کے کنائی اور مجازی معنی استعمال کر کے قرآنی احکام کی اس انداز میں تاویل و وضاحت فرمائی کہ جس سے شریعت کی عاید کردہ پابندیاں ایک ایک کر کے ختم ہو جاتی تھیں، تو ان مبشرات سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو مغربی تہذیب و افکار میں پلا بڑھا اور اسلام کے مبادیات تک سے ناواقف ہوتا ہے۔ بہت خوش ہو جاتا ہے۔ بھلا جس شخص کو اپنے اتباعِ ہوائے نفس کی پوری آزادی حاصل رہے اور اس سے اس کے ایمان و اسلام کا بھی کچھ نہ بگڑے تو اس کے لیے اس سے زیادہ اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے؟ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے عقائد و افکار میں کتنا ہی ملحد اور اعمال و کردار میں کتنا ہی مفسد کیوں نہ ہو جائے وہ اپنے آپ سے اسلام کے لیبل کو اتارنا گوارا نہیں کرتا۔ نہ تو وہ یہ گوارا کرتا ہے کہ مذہب تبدیل کر کے یہودی یا عیسائی یا ہندو یا سکھ ہو جائے اور نہ ہی یہ گوارا کرتا ہے کہ اسے اس کے اعمال و عقائد کی بنا پر کوئی بدکار، کافر، مرتد یا ملحد قرار دے۔ لہٰذا ایسے حضرات کو جو راستہ منکرینِ حدیث نے دکھلایا ہے وہ ان کے لیے نہایت پسندیدہ ہے۔

آج کے دور میں اگرچہ بعض دوسرے بلادِ اسلامیہ میں بھی اس فتنہ کا سراغ ملتا ہے۔ مگر جو پذیرائی اسے برصغیر پاک و ہند میں ہوئی ہے سو دوسرے مقامات پر نہیں ہوئی۔ برصغیر پاک و ہند میں اس طبقہ کا سب سے بڑا ترجمان ادارہ طلوعِ اسلام ہے۔ جس نے چند ایسے نظریات کی داغ بیل ڈالی ہے۔ جو اس کی شہرت اور پذیرائی کا اچھا خاصہ سبب بن گئے ہیں۔ مثلاً ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی ہمنوائی نے اسے کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ میں مقبول بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ پرویز صاحب ڈارون جیسے ہی سائنٹسٹ حضرات کو حقیقی علماء کا مصداق سمجھتے ہیں۔ نظریہ مساواتِ مرد و زن ،، ادارہ اپوا یا اسی قبیل سے تعلق رکھنے والے دوسرے اداروں کی خواتین کے دل کی آواز ہے۔ انکارِ سنت اور نظریہ مرکزِ ملت نے جج صاحبان کو اجتہاد کے بے پناہ اختیار دے کر ان میں پذیرائی حاصل کر لی ہے۔ اور نظریہ نظامِ ربوبیت اشتراکیہ سے تعلق رکھنے والے حکمران طبقہ کے لیے بہت خوش آئند ہے اور یہی وہ

---

[1] موجودہ دور کی علمی سطح سے مراد سائنسی نظریات کی ہمنوائی اور مرعوبیت اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق سے مراد اتباعِ ہوائے نفس ہے۔ ان الفاظ کا ہیر پھیر منزہ رہے مگر بات ایک ہی ہے۔

طبقے ہیں جو کسی ملک کے تہذیب و تمدن اور مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گویا موجودہ دور کا یہ حملہ دوسری صدی کے حملہ سے وسیع تر بھی ہے اور شدید تر بھی۔

تاہم دو باتیں ایسی ہیں جو ہمارے لیے قابل اطمینان ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی اکثریت آج بھی سنت رسول کے بغیر قرآن کے احکام و فرامین کی تعمیل کا کوئی دوسرا تصور قبول کرنے پہ تیار نہیں۔ حتیٰ کہ مذکورہ بالا طبقوں کی اکثریت بھی اس نظریہ کو مردود قرار دیتی ہے اور دوسرے یہ کہ علمائے امت کی ایک کثیر جماعت اس فتنہ کے بھرپور دفاع کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ عربی زبان میں پہلے ہی ایسا لٹریچر موجود تھا جس میں سابقہ دور کے منکرین حدیث کے حدیث پر اعتراضات اور پھر ان اعتراضات کے مسکت جواب بھی موجود تھے۔ جن میں ایک طرف تو سنت رسول کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا گیا تھا۔ تو دوسری طرف اس بات کی بھی وضاحت موجود تھی کہ سنت رسول ﷺ ہم تک نہایت قابل اعتماد ذرائع سے پہنچی ہے۔ کچھ لوگوں نے تو ایسی کتابوں کے تراجم اردو زبان میں منتقل کیے اور کچھ حضرات نے نئی تصنیفات بھی پیش کیں جو بالعموم ایسے ہی مسائل سے متعلق ہیں۔ مگر آج کا منکر حدیث طبقہ ان سوالوں کے جواب بھی پیش کر رہا ہے اور ان پر مزید اعتراضات وارد کر رہا ہے۔ نیز اس نے تشکیک کے چند مزید پہلو اجاگر کر کے انکار سنت کے فتنہ کی کئی نئی راہیں بھی کھول دی ہیں۔ اندریں حالات میرے خیال میں دو پہلوؤں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ اصولی بحثوں سے ہٹ کر براہ راست منکرین حدیث کے اعتراضات کو ہی بنیاد بنا کر ان کا جواب پیش کرنا چاہیے۔ اور دوسرے یہ کہ انکار سنت کے بعد جو نظریات یہ حضرات پیش فرما رہے ہیں۔ ان کا قرآن اور صرف قرآن کی روشنی میں پورا پورا محاسبہ کرنا چاہیے۔ ان پہلوؤں پر بھی اگرچہ کچھ کام ہوا ہے تاہم یہ دونوں پہلو ہنوز تشنہ تکمیل ہیں۔

میں نے انہیں پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر آج سے تین چار سال پہلے مضامین لکھنا شروع کیے۔ جو ماہنامہ ترجمان الحدیث اور محدث میں چھپتے رہے ہیں۔ عجمی تصورات کا پہلا، دوسرا اور تیسرا دور، نظریہ ارتقاء، مرکز ملت، قرآنی نظام ربوبیت، حسبنا کتاب اللہ، وضع حدیث اور وضاعین، فکر آخرت اور طلوع اسلام اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ ان مضامین کو علمی حلقہ میں خاصی پذیرائی ہوئی۔ اور ان مضامین کو مکمل کرنے اور کتابی شکل دینے کے تقاضے شروع ہو گئے۔

مگر میرے ذہن میں جو کچھ مواد موجود تھا وہ اس سے کہیں بہت زیادہ تھا جو چھپ چکا تھا۔ اتنی ضخیم کتاب کی تیاری کے لیے خاصا وقت بھی درکار تھا۔ اور مالی مشکلات بھی حائل تھیں۔ پھر جب یہ تقاضے بڑھنے لگے اور کچھ احباب نے ڈھارس بھی بندھائی تو میں نے ماہناموں کے لیے مضامین لکھنے کا سلسلہ بند کر دیا۔ اور یکسو ہو کر اس کام کی طرف لگ گیا۔ اور آج ایک سال بعد یہ کام اللہ کے فضل و کرم

اور اس کی توفیق سے پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

میں نے اس کتاب کو مندرجہ ذیل چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

حصہ اوّل:- معتزلہ سے طلوعِ اسلام تک۔ اس حصہ میں منکرینِ حدیث کی سلسلہ وار تاریخ، انکار سنت کے اسباب اور عجمی تصورات کی اسلام میں درآمد، معتزلہ کے مخصوص عقائد و نظریات اور نتائج پر بحث کی گئی ہے۔

حصہ دوم:- طلوعِ اسلام کے نظریات:- اس حصہ میں حسبنا کتاب اللہ، عجمی سازش، نظریۂ ارتقاء، مساواتِ مرد و زن، مرکزِ ملت اور قرآنی نظامِ ربوبیت پر روشنی ڈال کر عقلی نقلی اور تاریخی دلائل سے ان نظریات کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ عجمی سازش تو "اسبابِ زوالِ امت" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ مساواتِ مرد و زن، "طاہرہ کے نام خطوط" کے جواب میں اور قرآنی نظامِ ربوبیت "نظامِ ربوبیت" کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔

حصہ سوم:- قرآنی مسائل "قرآنی فیصلے" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس حصے میں صرف ان تیرہ مسائل کا ذکر ہے۔ جن کا جواب دینا ضروری تھا اور ان پر قرآن ہی کی رو سے گرفت کی جا سکتی تھی۔ اور وہ مسائل یہ ہیں۔ قرآنی نماز، قرآنی زکوٰۃ و صدقات۔ قربانی، اطاعت والدین، ناسخ و منسوخ، عذاب قبر، ترکہ اور وصیت، یتیم پوتے کی وراثت، تلاوتِ قرآن پاک، نکاح نابالغاں، تعدد ازدواج، غلام اور لونڈیاں، رجم اور حد رجم۔

حصہ چہارم:- دوامِ حدیث:- یہ حصہ حافظ صاحب جیراجپوری کے ان مقالات کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جو مقامِ حدیث میں مندرج ہیں۔ فنِ حدیث میں تشکیک کے جن پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں۔ روایتِ حدیث، کتابت و تدوینِ حدیث، تنقیدِ حدیث، اصولِ حدیث، وضعِ حدیث اور منعِ حدیث۔ اور حدیث کو دین سمجھنے کے نقصانات۔

حصہ پنجم:- دفاعِ حدیث:- یہ حصہ مقامِ حدیث کے باقی ماندہ مقالات کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ان مقالات کا بیشتر حصہ کتبِ احادیث کے داخلی مواد پر اعتراضات اور اس کے جوابات سے متعلق ہے۔ عنواناتِ ابواب یہ ہیں۔ حدیث پر چند بنیادی اعتراضات (۲) حدیث اور چند نامور اہلِ علم و فکر (۳) جمعِ قرآن روایات کے آئینے میں (۴) تفسیر بالحدیث (۵) متعہ کی حرمت (۶) حصولِ جنت احادیث کی رو سے (۷) بخاری کی قابلِ اعتراض احادیث (۸) خلفائے راشدین کی شرعی تبدیلیاں۔

حصہ ششم:- طلوعِ اسلام کا اسلام:- اس حصہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ طلوعِ اسلام کا اپنا اسلام کیسا ہے۔ اور انکار سنت کے بعد وہ دوسرے مسلمانوں کو کس طرح کے اسلام کی راہ دکھلاتا

چاہتا ہے۔ اس حصہ کے ابواب یہ ہیں۔ طلوع اسلام کا ایمان بالغیب۔ طلوعِ اسلام اور ارکانِ اسلام وحی الٰہی سے روشنی حاصل کرنے کا طریقہ۔ مفکر قرآن پر قرآنی فکر کی اثراندازی۔ پرویزی لٹریچر کی خصوصیات۔

آخر میں ایک باب بطور ضمیمہ شامل ہے۔ جس کا عنوان ہے "طلوع اسلام سے چند بنیادی سوالات"۔ یہ سوالات جہاں ایک طرف اس کتاب کا لب لباب ہیں تو دوسری طرف طلوعِ اسلام کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگرچہ میں اصولی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ تحریر کی زبان نرم اور حلیمانہ ہونی چاہیئے۔ تاہم مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بتقاضائے بشریت کہیں کہیں زبان میں تلخی آگئی ہے جس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ٹھیک طور پر اسلام کو سمجھنے اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عبدالرحمان کیلانی

دارالسلام۔ وسن پورہ۔ لاہور

کتابیات

۱۔ قرآن مجید	ــــــ	ــــــ
۲۔ مختلف تراجم وتفاسیر حسب ضرورت	ــــــ	ــــــ
۳۔ کتب احادیث حسب ضرورت	ــــــ	ــــــ
۴۔ جامع بیان العلم	حافظ ابن عبدالبر اندلسی	طباعۃ المنیریہ ۔ مصر
۵۔ تذکرۃ الحفاظ	شمس الدین الذہبی	دار الاحیاء التراث الاسلامی بیروت
۶۔ توجیہ النظر	طاہر بن صالح الجزائری	
۷۔ صحیفہ ہمام بن منبہ	ڈاکٹر حمید اللہ	ملک سنز کارخانہ بازار فیصل آباد
۸۔ فقہ السنہ	سید سابق	دار الفکر بیروت
۹۔ نیل الاوطار	امام شوکانی	ادارۃ البحوث بمملکۃ العربیۃ السعودیہ
۱۰۔ نخبۃ الفکر مع شرح نزہۃ النظر	ابن حجر عسقلانی	ـ
۱۱۔ مفردات القرآن (اردو)	امام راغب اصفہانی	اہلحدیث اکیڈمی کشمیری بازار لاہور
۱۲ منجد	ـ	دار الاشاعت کراچی
۱۳ منتہی الارب	ـ	کشمیری بازار لاہور
۱۴۔ فقہ اللغۃ	اسمٰعیل الثعالبی	مؤسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان قم (ایران)
۱۵۔ فروق اللغویہ	ابو ہلال عسکری	مکتبہ بصیرتی ۔ قم ۔ شارع ارم ایران
۔ رحمۃ للعالمین	قاضی سلیمان منصور پوری	غلام علی اینڈ سنز لاہور
۱۶۔ تاریخ الحدیث	ابو الزہرۃ	ناشران قرآن لمیٹڈ ۔
۱۷ والمحدثین	ترجمہ غلام احمد حریری	اردو بازار لاہور
۱۸۔ تاریخ حدیث	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	مکتبہ رشیدیہ ۔ لاہور
۱۹۔ تدوین حدیث	مناظر احسن گیلانی	از ماہنامہ برہان دہلی
۲۰۔ اصطلاحات المحدثین	شیخ الحدیث سلطان محمود	فاروقی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
۲۱۔ انتخاب حدیث	عبدالغفار حسن	اسلامک پبلی کیشنز ۔ لاہور
۲۲۔ سنت کی آئینی حیثیت	مولانا مودودی رح	〃

۲۳۔ خلافت وملوکیت	ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز۔ لاہور
۲۴۔ مسئلہ جبر وقدر	″	″
۲۵۔ حجیتِ حدیث	مولانا محمد اسمٰعیل سلفی	اسلامک پبلشنگ ہاؤس۔ لاہور
۲۶۔ جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث	″	مکتبہ سلفیہ۔ لاہور
۲۷۔ انکار حدیث کے نتائج	محمد سرفراز خاں	انجمن اسلامیہ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
۲۸۔ تفہیم اسلام	مسعود بی۔ایس۔ای	جماعت المسلمین کراچی
۲۹۔ حقیقۃ الفقہ	حافظ محمد یوسف جے پوری	ادارہ اشاعت دین آف مومن پورہ بمبئی
۳۰۔ آسمانی فیصلے	میاں محمد حافظ قصوری	ادارہ عروج اسلام خوشاب۔ سرگودہا۔
۳۱۔ دائرۃ المعارف اردو	—	پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور
۳۲۔ انسائیکلوپیڈیا اردو	—	فیروز سنز۔ لاہور
۳۳۔ علم جدید کا چیلنج	وحید الدین خاں	ادارہ ضیاء الحدیث مدنی روڈ مصطفیٰ آباد لاہور
۳۴۔ مذہب اور تجدید مذہب	پروفیسر عبدالحمید صدیقی	اسلامک پبلی کیشنز۔ لاہور
۳۵۔ اسلامی ریاست	شمیم حسین قادری	علماء اکیڈمی۔ لاہور
۳۶۔ الفاروق	شبلی نعمانی	رنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور
۳۷۔ حکایات عزیمت	بدر عالم	گلستان پبلیکیشنز۔ لاہور
۳۸۔ حکومت اور علماء ربانی	حافظ عبداللہ روپڑی	مکتبہ نذیریہ۔ لاہور
۳۹۔ سنت نبویہ اور قرآن کریم	ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار	مجلس دعوت وتحقیق اسلامی کراچی
۴۰۔ تفسیر القرآن	سر سید احمد خاں	کشمیری بازار لاہور
۴۱ حلال وحرام	عطاء اللہ پالوی	غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور
۴۲ دو اسلام	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	″
۴۳ ضرب حدیث	صادق سیالکوٹی	نعمانی کتب خانہ لاہور
۴۴ قرآن اور پرویز، مع واشنگ	سید محمد حسن	سپر آرٹ پریس کراچی
۴۵ فتنہ انکار حدیث	ولی حسن خان	المعین ٹرسٹ کراچی
۴۶ اسلام اور دین آسان	جعفر شاہ پھلواری	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۴۷ تعدد ازدواج	″	″
۴۸ اجتہادی مسائل	″	″

طلوعِ اسلام کا لٹریچر

۱۔ مقامِ حدیث
۲۔ قرآنی فیصلے
۳۔ نظامِ ربوبیت
۴۔ طاہرہ کے نام خطوط
۵۔ اسبابِ زوالِ امت
۶۔ تبویبُ القرآن
۷۔ لغاتُ القرآن (۴ جلد)
۸۔ مفہوم القرآن (۳ جلد)
۹۔ مطالب الفرقان
۱۰۔ کتاب التقدیر
۱۱۔ تصوّف کی حقیقت
۱۲۔ معراجِ انسانیت
۱۳۔ شاہکارِ رسالت
۱۴۔ پاکستان کا معمارِ اول۔ سرسید
۱۵۔ ابلیس و آدم
۱۶۔ طلوعِ اسلام کے مختلف پرچہ جات
۱۷۔ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ مختلف پمفلٹ۔

آئینہ پرویزیت حصہ اول — معتزلہ سے طلوع اسلام تک

فہرست مضامین

باب (۱)

عقل پرست فرقوں کا آغاز

جب سے انسان نے اس دنیا میں ہوش سنبھالا ہے تین سوال اس کی توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ یہ کائنات از خود معرض وجود میں آگئی ہے یا کوئی اس کا پیدا کرنے والا بھی ہے؟

۲۔ اس کائنات کا اور انسان کا آپس میں کس قسم کا تعلق ہے؟ نیز اس کی پیدائش کا کچھ مقصد بھی ہے یا یہ اپنی موت کے ساتھ ختم ہو جائے گا؟

۳۔ اس کائنات کی خالق کوئی مقتدر ہستی ہے؟ اور اگر ہے تو اس کا اور انسان کا آپس میں کس قسم کا تعلق ہے؟

گویا خدا، کائنات اور انسان کا باہمی تعلق ہی وہ راز ہے جس کی عقدہ کشائی میں انسان حضرت آدم سے لے کر آج تک منہمک ہے۔ اور غالباً آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا اور فی الحقیقت یہ سوالات ہیں بھی اتنے اہم کہ جب تک کوئی شخص ان کے جواب میں کوئی نقطہ نظر اپنے ذہن میں قائم اور پختہ نہ کر پائے وہ یہ شخص سوچ ہی نہیں سکتا کہ اسے اس دنیا میں کس حیثیت سے زندگی گزارنا ہوگی۔ بالفاظ دیگر یہی وہ بنیادی باتیں ہیں۔ جن پر انسان کی زندگی کے طرز عمل کا انحصار ہوتا ہے۔

انسان کی طبعی زندگی دوسرے عام حیوانات سے ملتی جلتی ہے اور اس کے طبعی تقاضے بھی یعنی مفاد خویش، تحفظ خویش اور بقائے نسل بھی وہی ہیں۔ جو دوسرے جانداروں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف اور ممتاز بھی ہے۔ مثلاً

۱۔ اسے اپنے مستقبل اور اپنی موت کا احساس ہے۔ اسی وجہ سے یہ مفاد خویش یا خود غرضی میں دوسرے جانداروں سے بہت آگے ہے اور اسے کل کے لیے جمع کرنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے جو دوسرے جانوروں میں کم ہی پائی جاتی ہے۔

۲۔ اسے خیر و شر کی تمیز بھی عطا کی گئی ہے اور قوت اختیار اور ارادہ بھی حتیٰ کہ ایک وقت ایسا

بھی آتا ہے کہ وہ تحفظِ خویش کے فطری داعیہ کے علی الرغم کسی جذبہ کے تحت اپنی جان تک بھی دے دیتا ہے اور

۲۔ اسے عقل و شعور کا وافر حصہ عطا کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے وہ چند معلوم اور دیکھی ہوئی اشیاء سے مزید کچھ حقائق اور نتائج کا سراغ لگانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ جسے اصطلاحی زبان میں علت (CAUSE) اور معلول (EFFECT) سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مشاہدات کو دیکھ کر اس کی علت بھی معلوم کرنا چاہتا ہے اور اس سے آگے معلول بھی اور یہی وہ فطری داعیہ ہے۔ جس کی وجہ سے انسان اس کائنات میں اپنا مقام متعین کرنے پر کسی حد تک مجبور بھی ہے۔

اس عقل و شعور کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان محض اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر یہ عقدہ حل کرنے میں ناکام ہی رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے۔ اور کائنات لامحدود۔ اور ایک محدود چیز لامحدود کا ادراک اور احاطہ کرنے سے قاصر ہے انسان کے سامنے کئی ایسی معلومات اور ایسے مشاہدات آ جاتے ہیں جہاں علت و معلول کا یہ فلسفہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اور ایسا تعلق قائم کرنے سے عقل جواب دے دیتی ہے۔

عقل کی اسی مجبوری کی وجہ سے خالقِ کائنات نے انسان کی خود رہنمائی فرمائی۔ ابو البشر حضرت آدمؑ جہاں پہلے انسان تھے وہاں وہ پہلے نبی بھی تھے۔ اپنے خدائی پیغام یا وحی کے ذریعہ خالق کائنات نے انسان کو بتا دیا کہ یہ کائنات اور اسی طرح خود تمہیں بھی میں نے ہی پیدا کیا ہے۔ یہ کائنات تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ تم اشیائے کائنات سے جب اور جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو۔ اور یہ کہ اگر تم میری ہدایت کے مطابق زندگی گزارو گے تو دنیوی اور اخروی زندگی کی سرفرازیوں سے ہمکنار ہو گے (۲/۳۸)

عقل پرست اور ان کے مختلف فرقے

لیکن اس واضح ہدایت کے باوجود بعض اصحاب دانش نے اپنی عقل و فکر کو ہی رہنما بنایا پھر عقل و دانش بھی سب کی ایک جیسی نہیں ہوتی، کہ ایک جیسے نتائج پیدا کرے۔ لہٰذا ان میں بھی مختلف گروہ پیدا ہو گئے جو مختصراً درج ذیل ہیں۔

۱۔ **مادہ پرست اور دہریے** ان لوگوں نے جب کائنات اور اس کی تخلیق پر غور و فکر کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ مادہ قدیم ازلی اور ابدی ہے، جو مختلف ادوار سے گزرتا ہوا اس کائنات کی شکل میں آیا ہے، یہ زمین و آسمان اور یہ چاند تارے اور سورج سب کائنات کے فطری قوانین کے تحت حرکت کر رہے ہیں۔ اور یہ سب اتفاقات کا نتیجہ

ہیں۔ اتفاق ہی سے مادہ کے مختلف اجزائے کیمیاوی عمل سے پانی معرض وجود میں آیا۔ پھر اتفاق ہی سے اس مادہ کے مختلف اجزائے کیمیاوی عمل سے زندگی کی نمود ہوئی۔ جو نباتات اور حیوانات کی راہوں سے گزرتی ہوئی انسانی شکل میں آئی ہے۔ انسان بھی دوسری موجودات کی طرح پیدا ہوتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کی حقیقت کچھ نہیں قرآن کریم نے اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۲۴﴾

اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے اور جیتے ہیں۔ ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں۔ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔

آیت بالا سے واضح ہے کہ اس گروہ کے نظریات محض ظن اور قیاس پر مبنی ہیں جن کے نیچے کوئی ٹھوس سائنٹیفک بنیاد نہیں اس گروہ کو دہریہ، مادہ پرست یا مادیین کہتے ہیں۔

۲۔ فلاسفر اور سائنس دان

اسی گروہ میں سے فلاسفروں اور سائنس دانوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو یہ بات ماننے پر مجبور ہو گیا کہ اس وسیع کائنات کے لیے ایک علت العلل کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ ورنہ کائنات کے ایسے منظم اور مربوط نظام کا قائم ہونا محالات سے ہے (اسی علت العلل کو مذہب کی زبان میں خدا کہا جاتا ہے) جیسے سر آئزک نیوٹن جو کشش ثقل و قوت جاذبہ (GRAVITY) اور قوانین حرکت کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے، نے کائنات کے وسیع مطالعہ کے بعد اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ محض قوت جاذبہ کا نتیجہ ہوں۔ قوت جاذبہ تو کواکب کو سورج کی طرف دھکیلتی ہے اس لیے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کوئی خدائی ہاتھ موجود ہو۔ جو باوجود قوت جاذبہ کی کشش کے ان کو اپنے مدارات پر قائم رکھ سکے۔ کوئی سبب طبیعی ایسا نہیں تلایا جا سکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ بند کر دیا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگانے میں ہمیشہ معین مدارات اور ایک خاص حیثیت میں ہی حرکت کریں جس میں کبھی تخلف نہ ہو۔ پھر کواکب کی حرکات اور درجات سرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم رکھا گیا ہے کوئی سبب طبیعی نہیں جن سے ان منظم و محفوظ نوامیس کو وابستہ کر سکیں۔ ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم و علیم کے ماتحت ہے، جو ان تمام اجرام سماویہ کے مواد اور ان کی ماہیت سے پورا واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس مادہ کی کس قدر مقدار سے کتنی

قوتِ جاذبہ صادر ہوگی۔ اس نے اپنے زبردست اندازہ سے کواکب اور شمس کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کیے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے تصادم اور تزاحم نہ ہو اور سارا عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے" (تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی حاشیہ آیت نمبر ۵ / ۶)

یہی وہ فلاسفروں اور سائنس دانوں کی مجبوری ہے جس نے انہیں ایک علت العلل یا عقلِ کل تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس گروہ کے سرخیل یونانی فلاسفر افلاطون اور ارسطو تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ارسطو (۳۲۲ ق م) کے متعلق مشہور ہے کہ اسے کسی یہودی عالم نے اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ تو اس نے کہا کہ میں سوچ کر بتاؤں گا۔ سوچ بچار کے بعد اس نے اس مذہب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وحی الٰہی خدا کے متعلق جو تصور پیش کرتی ہے اس کے افکار و نظریات اس سے لگا نہیں کھاتے تھے اور دوسری وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی تھی کہ یہ لوگ اپنے آپ کو پیغمبروں سے کم مرتبہ کے انسان نہیں سمجھتے۔ خدا کے متعلق ارسطو کے نظریات یہ تھے۔

الٰہیاتِ ارسطو وہ ایک مجرد تصور ہے ایک مکمل اور جامع تصور۔ یہ کائنات جو خالق کی مظہر ہے نامکمل اور ناقص ہے اور اس کی حمد و ثنا کے ذوق اور اس کی محبت کے جوش میں ارتقا اور ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔ باری تعالیٰ کا اپنا کوئی مادی وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ علت العلل یا بنیادی علت ہے۔ اس سے کائنات میں حرکت و نمو پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر کائنات کے رنگا رنگ مظاہر اور اس کی حرکت کے پیچھے ایک ایسا تصور کارفرما ہے۔ کہ قدیم، قائم بالذات اور سرمدی ہے۔ یہی ارسطو کے نزدیک خدا کا تصور ہے[1] اس فلسفے کے مطابق چونکہ سوائے خدا کے مجرد تصور کے کوئی شئے قدیم نہیں، بلکہ ساری اشیاء حادث ہیں۔ اس لیے خدا کی صفات بھی حادث اور نامکمل ہیں۔ اس کے تصورات کو مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ علت العلل یا ذاتِ حق مجرد تصور ہے۔

۲۔ وہ مستقل قائم بالذات، برحق اور قدیم ہے۔

۳۔ وہ جانِ جہان ہے اور ساری کائنات اس کا مظہر ہے۔

---

[1] وہ کہتا ہے مثلاً اس کا تصور ہم اس بنا پر کرتے ہیں کہ دنیا میں میٹھی چیزیں موجود ہیں۔ اور سرخی اور سفیدی کا بھی اسی وجہ سے شعور رکھتے ہیں کہ دنیا میں بہت سی چیزیں رنگ کے اعتبار سے سرخ اور سفید کے درمیان موجود ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ سرخی کا تصور کسی شئے کے بغیر ممکن نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سرخی کے تصور کے ساتھ کسی ایک متعین شئے یا چند مخصوص اشیاء کا تصور کسی ایسی چیز کے ساتھ ہی کیا جا سکتا ہے جو سرخ ہو۔ اس سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اصل حقیقت سرخی ہے اور یہی مستقل اور پائیدار ہے اسی کا تصور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ باقی رہے پیکر محسوس جن میں یہ جلوہ گر ہوتی ہے یہ سب اعتباری چیزیں ہیں۔

۴ - وہ ان سب صفات سے عاری ہے جن کی نسبت انسان کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ صفات حادث ہوتی ہیں اور ذاتِ حق قدیم ہے۔

۵ - ذاتِ باری نے دنیا کو پیدا کیا۔ اسے حرکت دی۔ اسی بنا پر وہ پوری کائنات اور اس کی حرکت کی بنیادی علت ہے۔

۶ - ساری کائنات اس کی حمد و ثنا میں منہمک ہو کر اور اس کی محبت سے سرشار ہو کر ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔ لیکن یہ ارتقاء اسے کبھی بھی باری تعالیٰ کی طرح کامل نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ کائنات مادی وجود سے آزاد نہیں ہو سکتی۔" (مذہب و تجدید مذہب: پروفیسر عبدالحمید صدیقی ص ۱۴۴)

گویا ارسطو اور اس طرح کئی دوسرے حکمائے فرنگ کے نزدیک خالق کی حیثیت محض ایک گھڑی ساز کی سی ہے جس نے گھڑی بنا کر اس میں ایک دفعہ چابی بھر دی ہے اور اب یہ گھڑی خود ہی چل رہی ہے۔

۳ - لاادریت

پھر انہیں مذکورہ دو گروہوں میں سے ایک تیسرا گروہ پیدا ہوا۔ جو نہ تو خدا کا انکار کرتا ہے اور نہ اقرار۔ اسی لیے انہیں "لا ادری" یعنی "کوئی رائے نہ قائم کرنے والا" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی عقل کی تنگ داماں سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ لہذا جہاں کوئی بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے تو اسے قوانین فطرت یا محض فطرت (NATURE) سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اور نیچر سے ان کی مراد کائنات میں وہ جاری و ساری قوانین ہیں۔ جن تک انسانی علم کی بالعموم رسائی ہو چکی ہو یا مشاہدہ میں آچکے ہوں۔ یا جن لگے بندھے قوانین کے تحت یہ کائنات سرگرم عمل ہے۔ یہ لوگ خدا کی جگہ فطرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے مان لینے سے اور بھی بہت سی چیزوں کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ لہذا یہ لوگ اس سلسلہ میں کوئی رائے قائم نہیں کرتے۔

وحیٔ الٰہی اور بنیادی سوالات کا حل

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ارسطو کا نظریہ بھی زندگی کے جملہ مسائل کا حل پیش نہیں کرتا۔ وہ مابعد الطبیعات یا مرنے کے بعد کی زندگی کا ایک دھندلا سا عکس پیش کرتا ہے۔ وہ یہ بھی وضاحت نہیں کرتا کہ انسان کی زندگی کا کچھ مقصد بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ وہ محض "الٰہیات" سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ لہذا بنی نوع انسان کا ایک کثیر طبقہ ایسا بھی رہا ہے۔ جو اس باری تعالیٰ کی ہدایات یا وحی خداوندی پر ایمان لایا۔ یہ وحی خداوندی جو دنیا کے تقریباً تمام مقامات پر مختلف ادوار میں انبیاء پر خدا کی طرف سے نازل ہوتی رہی انسانی زندگی کے جملہ مسائل کا ایک ہی حل پیش کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:-

۱ - اس کائنات کا خالق ذاتِ باری یا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو قدیم و ازلی و ابدی

ہے۔ وہ اپنی علم وحکمت سے اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ انسان کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔ اور کائنات اور اس کی تمام اشیاء حادث اور فنا ہونے والی ہیں۔

۲۔ کائنات کی جملہ اشیاء اس باری تعالیٰ کی مخلوق اور اسی کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت سرگرم عمل ہیں۔ انسان خود بھی اپنی طبعی زندگی کے لحاظ سے ان قوانین کا پابند اور ان کے آگے مجبور محض ہے۔ لیکن اسے خیر وشر کی تمیز اور قوت ارادہ واختیار بھی کسی حد تک عطا کی گئی ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے۔ کہ وہ ان اختیاری امور میں بھی دوسری اشیائے کائنات کی طرح ۔ اللہ تعالیٰ کی منشا ومرضی کے مطابق بنا دے۔ اسی چیز کا نام عبادت ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی عبادت میں سرگرم عمل ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی انسان سمیت تمام اشیائے کائنات کا معبود ہے۔

۳۔ کائنات اور انسان کا آپس میں تعلق یہ ہے کہ کائنات کی جملہ اشیاء انسان کے تابع فرمان بنا دی گئی ہیں۔ وہ ان کی ہیئت وکیفیت معلوم کر کے ان سے جیسے چاہے کام لے سکتا ہے۔ انسان کو کائنات کے عظیم الجثہ کروں، فضا کی پنہاں قوتوں اور زمین میں چھپے ہوئے مختلف عناصر سے خائف ہونے یا ان کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی نہ کوئی وجہ ہے اور نہ ضرورت اگر وہ ایسا کرے گا تو اسی کا نام شرک ہے جو ظلم عظیم اور ناقابل معافی جرم ہے۔ اگر وہ صرف اپنے خالق ذاتِ باری کی ہدایات کا تابع فرمان ہو کر اسی کے سامنے سربسجود ہوگا۔ اور اپنی حاجات پیش کرے گا۔ تو یہی چیز توحید ہے۔ یہی توحید انسان کو کائنات میں بلند ترین مقام عطا کرتی ہے۔

۴۔ پھر اگر انسان خدا کی ہدایات پر عمل پیرا ہوگا۔ تو اسے ان کے ان "اعمال خیر" کا اچھا بدلہ یا جزا ملے گی اور اگر نافرمانی کرے گا تو اسے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ ان کو ان "اعمالِ شر" کی سزا ضرور ملے گی۔ یہ جزا و سزا کا قانون مذہب کی اصطلاح میں دین کہلاتا ہے۔ جزا و سزا کا قانون اسی دنیا میں بھی لاگو ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں۔ مرنے کے بعد انسان کو یقیناً دوسری زندگی ملے گی۔ جہاں اس سے اس کے کیے ہوئے اعمال خیر وشر کا پورا پورا محاسبہ کیا جائے گا۔ اسی مرنے کے بعد کی دوسری زندگی کو اخروی زندگی یا آخرت کہتے ہیں۔

یہ ہے انسانی زندگی کے مسائل کا حل اور ہدایاتِ خداوندی یا وحی الٰہی کا خلاصہ جو تمام انبیاء کو ایک جیسی عطا ہوتی رہی ہے۔

ہندومت اور عقل پرستی

انبیاء کرام جن پر یہ ہدایاتِ خداوندی نازل ہوئیں وہ کوئی مافوق البشر ہستی نہیں، بلکہ

انسان ہی ہوتے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے وہ خود ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے لیکن مابعد کے ادوار میں ان تعلیمات پر کچھ تو اصحاب دانش کے فلسفہ کے سائے لہراتے رہے اور کبھی ان ہدایات پر انسان کی باطنی قوتوں اور کشف وجدان کا رنگ غالب آیا تو اس طرح لاتعداد فرقے پیدا ہوتے رہے۔

ہندومت پر عقل اور فلسفہ کا رنگ غالب آیا تو ان اصحاب دانش کے عقل و فہم میں یہ بات نہ آسکی کہ وجود باری تعالیٰ عدم سے کائنات کو کیونکر وجود میں لا سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ یہ بات تصور میں لا سکتے تھے کہ بے جان مادہ میں زندگی اور حرکت کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔ لہذا انہوں نے کہا کہ خدا، روح اور مادہ تینوں چیزیں ازلی ابدی ہیں۔ اب دیکھئے کہ روح کو ازلی ابدی تسلیم کر لینے کی بنا پر ان میں مندرجہ ذیل بنیادی عقائد و نظریات رواج پا گئے۔

ا۔ تمام ذی حیات یا جاندار اشیاء انسان کے ہم رتبہ ہیں۔ انسان کو کوئی حق نہیں کہ کسی موذی جانور کو گزند پہنچائے یا اسے مارے یا اپنے ذاتی انتفاع کی خاطر کسی جانور کو ذبح کر کے اس کا گوشت استعمال میں لائے۔ وحی الہٰی تو "وحدتِ انسانی" کا تصور پیش کرتی ہے لیکن انہوں نے اس کے بالمقابل "وحدتِ حیات" کا تصور پیش کیا جسے ان کی اصطلاح میں "اہنسا" کا نام دیا جاتا ہے۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ان کے فلاسفر "اہنسا" کی رو سے تو کسی موذی جانور کو تکلیف دینا تو مہا پاپ یا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب معاشرتی مسائل کی طرف توجہ مبذول کی تو بنی نوع انسانوں کو چار مختلف ذاتوں میں تقسیم کر کے "وحدتِ انسان" کے تصور کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ وحی الہٰی تو یہ سکھاتی ہے کہ تمام بنی نوعِ آدم کی اولاد ہیں۔ لہذا سب معاشرتی لحاظ سے ہم مرتبہ ہیں۔ اور نیز یہ کہ کائنات کی جملہ اشیاء حیوانات سمیت انسان کے تابع بنا دی گئی ہیں۔ وہ ان سب چیزوں سے ہدایات خداوندی کے تحت انتفاع کر سکتا ہے۔ لیکن یہ مذہب جب افراط کی طرف جاتا ہے تو موذی جانوروں کو تکلیف پہنچانے کو مہا پاپ سمجھتا ہے اور جب تفریط کی طرف رخ موڑتا ہے کہ انسان کے مختلف طبقے پیدا کر کے کسی کو خلد بریں پہ جا بٹھلاتا ہے اور کسی دوسرے کو مستقل عذاب الیم میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ب۔ روح کی ازلیت و ابدیت نے ہی مسئلہ تناسخ کو جنم دیا جسے ان کی زبان میں "آواگون کا چکر" کہا جاتا ہے۔ یعنی نیک اعمال سے انسانی روح مرنے کے بعد کسی بہتر پیکر محسوس میں داخل ہوتی ہے اور برے اعمال کرنے سے کسی کہتر مخلوق میں داخل ہو کر سزا پاتی ہے مثلاً کسی برے انسان کی روح مرنے کے بعد کسی گدھے یا کتے کے جسم میں داخل ہو کر سابقہ گناہوں کا بدلہ بھگتے گی اور کسی نیک آدمی کی روح اپنے سے زیادہ بہتر پیدا ہونے

والے انسان کے جسم میں داخل ہو کر اچھا بدلہ پائے گی اور یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔ جزا و سزا کا یہی قانونِ مکافات آواگون کے چکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ج۔ روح کی ترقی کے ان کے ہاں تین درجات ہیں۔ آتما یعنی وہ روح جو عام جانداروں میں پائی جاتی ہے۔ جب یہ روح نیک اعمال کی وجہ سے ترقی کرتی ہے۔ تو کسی مہا آتما یعنی بزرگ روح کے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ جیسے کہ ان کے ہاں مہاتما بدھ اور مہاتما گاندھی وغیرہ ہیں پھر جب یہ روح نیک اعمال کے ذریعے مزید ترقی کرتی ہے۔ تو پھر یہ پرماتما (سب سے بڑی روح یا ذاتِ خداوندی) میں جا کر مل جاتی ہے۔ تب جا کر ان کی مکمل نجات ہوتی ہے۔ اور یہی انسان کی روحانی ترقی کی آخری منزل ہے۔

مذہب میں بگاڑ کی صورتیں

روح کی ترقی اور نیک اعمال سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مادی جسم اور اس کے تقاضوں سے حتی الامکان پیچھا چھڑایا جائے۔ جس قدر مادی جسم کو معطل اور کمزور بنایا جائے گا۔ اسی قدر روح کی ترقی ہو گی۔ لہٰذا اس روحانی ترقی کے حصول کے لیے ان کے ایک مخصوص گروہ نے جسم کو مختلف قسم کی اذیتیں دے کر اور اس کے طبعی تقاضوں کو فنا کر کے نیز معاشرتی تعلقات سے منہ موڑ کر گوشہ نشینی کی راہبانہ زندگی اختیار کر لی۔ اس طرزِ زندگی کا بنیادی عقیدہ تو خالص فلسفیانہ ہے اور عملی طور پر مختلف ریاضتوں کے ذریعے انسان کی باطنی قوتوں کو بیدار کر کے یہ راہ طے کی جاتی ہے اس طریقِ زندگی کو دینِ طریقت بھی کہتے ہیں۔ جو بالعموم تمام مذاہب مثلاً یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور ہندو مت کا ایک خاص گروہ بدھ مت تو زندگی کا مقصد ہی یہی راہبانہ زندگی قرار دیتا ہے[1]

گویا اب تین چیزیں سامنے آ گئیں وحی، عقل اور کشف یا وجدان تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مذہب میں جب کبھی بگاڑ ہوا ہے۔ تو وہ وحی الٰہی میں تشکیک اور اس کے مقابلہ میں عقل یا وجدان کے استعمال میں افراط اور تفریط سے ہوا ہے۔ کشف و وجدان نے جب وحی الٰہی میں بے جا تنقید و مداخلت کی تو ایک علیحدہ طریقت کی بنیاد ڈالی۔ پھر اس میں مزید کئی فرقے پیدا ہو گئے سر دست ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ عقل نے وحی الٰہی کے مقابلہ میں افراط و تفریط سے کام لے کر کیا کچھ گل کھلائے ہیں۔

---

[1] اس دینِ طریقت کی تفصیل علیحدہ کتاب "شریعت و طریقت" میں پیش کی جا رہی ہے۔

عقل پرستی کا بگاڑ

پھر انہی مذہبی فرقوں سے ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جس پر وجدان کے بجائے عقل پرستی کا رنگ غالب آگیا۔ تو جس طرح روحانیین زبانی طور پر وحی کی اتباع ہی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وحی کے معانی ہی بدل کر انہیں "باطنی معانی" کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اسی طرح عقل پرست زبانی طور پر وحی الٰہی کی برتری کے قائل ہوتے ہیں۔ لیکن عملاً ہر دور کے غالب رجحانات اور مخصوص نظریات کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور وحی الٰہی کی تاویل و تحریف کر کے ان نظریات وافکار کو الہامی کتابوں سے ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہی وہ فرقہ ہے جس سے ہم آپ کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ اور یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں عقل پرستی کا آغاز کب ہوا، اور کس راستہ سے یہ ہم تک پہنچا ہے۔ اور کون کون سے غیر اسلامی یا عجمی تصورات اس فرقہ نے اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔

باب (۲)

عجمی تصورات کا پہلا دور

ا۔ فرقہ جہمیہ

اسلام پہلی صدی ہجری کے اواخر تک عجمی تصورات سے محفوظ و مامون رہا۔ دُوسری صدی کے آغاز میں ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ) کے زمانہ میں ایک شخص جہم بن صفوان ظاہر ہوا۔ جو ارسطو کے نظریۂ ذاتِ باری سے متاثر تھا۔ اور بزعم خویش اللہ تعالیٰ کی مکمل تنزیہہ بیان کرتا تھا۔ وہ بھی خدا کے متعلق تجریدی تصورات کا قائل تھا۔ اور خدا تعالیٰ کی ان صفات کی نفی کرتا تھا۔ جو قرآن و سنت میں وارد ہیں۔ اس نے تنزیہہ الٰہی میں اس قدر مبالغہ اور غلو سے کام لیا کہ بقول امام ابوحنیفہ اللہ کو لا شئے اور معدوم بنا دیا۔ وہ خدا کے لیے جہت یا سمت متعین کرنے کو شرک قرار دیتا تھا۔ وہ خدا کی طرف ہاتھ، پاؤں، چہرہ، پنڈلی جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے کی نسبت کرنے کو بھی ناجائز قرار دیتا تھا۔ وہ اس آیت :۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۷:۵۴) — پھر وہ عرش پر جا ٹھہرا

یا اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (۲۰:۵) — (رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا)

میں لفظ استویٰ کا ترجمہ استولیٰ سے کر کے بزعم خویش اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ بیان کرتا تھا۔ امام ابن قیم نے اپنے قصیدہ نونیہ کے درج ذیل شعر میں اسی چیز کی وضاحت فرمائی ہے

نُوْنُ الْيَهُوْدِ وَلَامُ جَهْمِيٍّ هُمَا فِيْ وَحْيِ رَبِّ الْعَرْشِ زَائِدَتَانِ

ترجمہ :۔ یہودیوں کا "نون" (حِطَّةٌ کی بجائے حِنْطَةٌ[1] کہنا) اور جہمیہ کا "ل" (استویٰ کو استولیٰ کہنا) رب العرش کی وحی سے زائد ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب التوحید حاشیہ از وحید الزمان [2] یہودیوں نے حطۃ کی بجائے حنطۃ (گندم یا معاشی فراوانی کا مطالبہ کر کے وہ بات کہہ دی جس کی طرف ان کی عقل نے رہنمائی کی۔

اب سوال یہ ہے کہ جب خود اللہ تعالٰے نے اپنے لیئے عرش پر قرار پکڑنے یا اپنے ہاتھوں، چہرہ، پنڈلی وغیرہ کا ذکر غیر مبہم الفاظ میں قرآن کریم میں فرمایا ہے تو اس کی تنزیہہ خود اس سے زیادہ بہتر اور کون کر سکتا ہے؟ رہی یہ بات کہ اس کا عرش کیسا ہے؟ یا وہ خود کیسا ہے اور کس طرح اس نے عرش پر قرار پکڑا ہے یا اس کا چہرہ اور ہاتھ کیسے ہیں۔ تو ہم یہ جاننے کے مکلف نہیں ہیں۔ کیونکہ اس نے خود ہی فرما دیا ہے۔ (لَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ) نیز فرمایا (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ) تو بس ایک مسلمان کا ایمان یہ ہونا چاہیئے کہ جو کچھ قرآن میں مذکور ہے اس کو جُوں کا توں تسلیم کرے۔ انہے عقل اور فلسفہ کی سان پر چڑھا کر اس کی دور از کار تاویلات و تحریفات پیش کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ اور نہ ہی قرآن ایسی فلسفیانہ موشگافیوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں پر یہ قرآن نازل ہوا تھا وہ اُمّی اور فلسفیانہ موشگافیوں سے قطعاً نابلد تھے پھر یہ قرآن اشاروں اور کنایوں کی زبان میں نہیں اترا بلکہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ ایسی ٹھیٹھ اور آسان زبان جسے ان پڑھ لوگ بخوبی سمجھ جاتے تھے ارسطو کی تعلیمات کی تائید میں جہم بن صفوان کے لیے یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی سے خوش یا کسی پر ناراض ہو سکتا ہے۔ اور جو آیات مثلاً رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ یا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وغیرہ قرآن پاک میں وارد ہیں ان سب کی دور از کار تاویلات پیش کر کے خدا تعالیٰ کی صفات سے "تنزیہہ" کرتا تھا۔ پھر جو لوگ ان کے ہم خیال پیدا ہوئے اور اس کے نام کی نسبت سے "جہمیہ" کہلائے۔ یہ لوگ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق اختلافات کے علاوہ کئی دوسرے امور میں بھی اہل سنّت والجماعۃ سے اختلاف رکھتے تھے لیکن انہیں یہاں زیر بحث لانا مقصود نہیں۔

علاوہ ازیں مسئلہ تقدیر میں یہ لوگ انسان کو مجبور محض سمجھتے تھے۔ وہ انسان کے ارادہ کو من جانب اللہ تصور کرتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ انسان خود مخلوق خدا ہے۔ لہٰذا مخلوق کے ارادہ کا مخلوق ہونا لازم آتا ہے۔ اسی طرح انسان کے افعال کا خالق بھی خدا ہے۔ انسان کی طرف افعال کی نسبت محض مجازی ہے۔ رہا جزا اور سزا کا مسئلہ تو جس طرح افعال جبری ہیں اسی طرح جزا اور سزا بھی جبری ہے یعنی جس طرح جبر کی بنا پر انسان اچھے اور بُرے افعال کرتا ہے۔ اسی طرح جبر ہی کی بنا پر اسے جزا اور سزا بھی دی جاتی ہے[1]

---

[1] مسئلہ جبر و قدر ص۵۸ از مولانا مودودی ؒ

۲۔ معتزلین (RATIONALISTS)

اسی زمانہ میں ایک اور شخص واصل بن عطاء (۸۰ - ۱۳۱ھ) کا ظہور ہوا۔ مشہور یہ ہے کہ واصل بن عطا حضرت حسنؒ بصری (م ۱۱۰ھ) کے درس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا حضرت حسنؒ بصری سے یہ اختلاف ہوا کہ آیا گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہی رہتا ہے۔ (جیسے مرجیہ کا خیال تھا) یا کافر ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ خوارج کہتے تھے) حضرت حسنؒ بصری کا یہ خیال تھا کہ وہ منافق ہوتا ہے۔ واصل بن عطاء نے اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کیا اور اپنے ہمنوا ساتھیوں کو لے کر آپ کے حلقہ درس سے اُٹھ کر مسجد کے کسی دوسرے کونے میں الگ جا بیٹھا۔ تو حضرت حسن بصریؒ نے کہا کہ اِعْتَزَلَ عَنَّا یعنی وہ ہم سے کنارہ کر گیا ہے۔

لیکن بات صرف اتنی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ واصل بن عطاء (۸۰ تا ۱۳۱ھ) ایک مکتبِ فکر کا بانی بن کر سامنے آیا۔ جو بعد میں اعتزال کے نام سے مشہور ہوا۔ ذاتِ باری تعالےٰ کے متعلق اس کے عقائد جہم بن صفوان سے ملتے جلتے تھے۔ یونانی فکر کا رنگ اس پر بھی غالب تھا۔ اس کے معتقدین بعد میں معتزلہ کہلائے۔ سیاسی لحاظ سے بھی ان لوگوں کے بعض عقائد اہلسنت والجماعت سے مختلف تھے۔ لیکن یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

جب ہارون الرشید (۱۷۰-۱۹۳ھ) کے عہد میں یونانی فلسفہ کے تراجم عربی زبان میں شائع ہوئے۔ تو یہ خیالات عام مسلمانوں تک پہنچے۔ تو اس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں دو قسم کے گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جس نے قرآن و سُنّت کے مقابلہ میں ارسطو کے نظریاتِ الٰہیہ کو کلیتہً رد کر دیا۔ دوسرا گروہ ان ذہین فطین لوگوں کا تھا جس نے محض اس بات پر ہی اکتفا نہ کیا کہ یونانی فلسفہ کو رد کر دیا جائے۔ بلکہ انھوں نے عام مسلمانوں کو اس یونانی فلسفہ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی خاطر فلسفہ کا جواب عقلی دلائل سے پیش کیا۔ اور علمِ کلام کی طرح ڈالی۔ ایسے لوگوں میں امام احمدؒ بن حنبل (م ۲۴۰ھ) امام بخاریؒ (م ۲۵۰ھ) امام غزالی، امام ابن تیمیہؒ اور امام ابنِ قیم وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ متاخرین میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ایسی ہی خدمات سرانجام دیں۔

اور تیسرا گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے یونانی افکار و نظریات سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور ان کو من و عن قبول کر لیا۔ اس گروہ کی

تخم ریزی تو پہلے واصل بن عطا کر ہی چکے تھے۔ یونانی افکار و نظریات سے تقویت پا کر ایک منظم فرقہ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان کے مخالفین تو انہیں معتزلین کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن یہ لوگ خود کو اہل العدل والتوحید" کہتے تھے۔ گویا یہ لقب ان کے ہر دو گونہ نظریات کا جن سے وہ عام مسلمانوں سے اختلاف رکھتے تھے ترجمان تھا۔

معتزلہ کے عقائد و نظریات

۱۔ مسئلہ تقدیر یا جبر و قدر

" اہلِ عدل کے لفظ سے وہ اپنے مخصوص عقیدۂ قدر کی وضاحت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں خود مختار ہے۔ باری تعالیٰ بس ان افعال کا خاموش تماشائی ہے۔ اس کی بلند ذات انسان کے معاملات میں دخیل ہونا پسند نہیں کرتی۔ انسان جس طرح اس طبعی دنیا میں قوانینِ طبیعی کا پابند ہے۔ اگر وہ آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو ہاتھ کا جلنا ناگزیر ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اسے اپنے بُرے اعمال کا عذاب یا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اگر انسانی اعمال میں اللہ کو دخیل مان لیا جائے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کا محاسبہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے[۱]۔ اسی طرح اگر انسانی اعمال کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ و منشاء کے تابع قرار دیا جائے۔ تو پھر انسانوں کو عذاب دینا معاذ اللہ ظلم کا ارتکاب ہے۔ جس سے وہ ذات پاک ہے۔ لہذا اللہ تعالےٰ کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے افعال واعمال میں پوری طرح خود مختار رہے۔ وہ اپنے اس دعوٰی کے ثبوت میں دوسری دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ اگر انسانی اعمال اللہ کی مرضی کے تابع ہوں اور انسان مجبورِ محض ہو۔ تو پھر اُسے انبیاء کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی ؟

تقدیر کی بحث | یہ مسئلہ بہت پرانا ہے۔ اس پر کئی طرح سے بحث ہو چکی ہے اس مسئلہ نے اس دور میں اتنا طول کھینچا کہ دو الگ الگ فرقے " قدریہ " اور " جبریہ " معرضِ وجود میں آ گئے۔ دونوں اپنے اپنے دلائل دیتے تھے۔ مگر کوئی دوسرے کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکا۔ حالانکہ یہ مسئلہ اتنا مشکل اور ٹیڑھا نہ تھا۔ جتنا کہ اسے بنا دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ عقلی دلائل اور علت و معلول کی کڑیاں ملانے سے حل ہونے والا نہیں اس کیلیے صرف اپنے دل کو

---

[۱] اسی بنا پر انہوں نے شفاعت کا بھی انکار کر دیا۔ المعتزلہ تالیف زہدی حسن جار اللہ ص۵۲)

ٹٹولنے کی ضرورت ہے۔ اس مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۴:۷۸)

اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر انہیں کوئی گزند پہنچے تو کہتے ہیں (کہ اے محمد ﷺ) یہ تمہاری وجہ سے ہے ان سے کہہ دو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے

گویا خلاقِ فطرت انسان کو مخاطب کر کے فرما رہا ہے، کہ وہ اتنی موٹی سی بات بھی سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم جو بھی ارادہ کریں اور پھر اس کو کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ کام عموماً ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ایسا ارادہ بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے سر توڑ کوشش بھی، لیکن وہ کام سرانجام نہیں پاتا۔ کیونکہ انسانی اعمال و افعال میں خارجی عوامل یا اتفاقات کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ زلزلے، سیلاب، قحط، بیماری، لڑائیاں، معاشی اتار چڑھاؤ، اکثر انسانوں کی پوری زندگی کا رُخ بدل دیتے ہیں اور اس کے ان سارے نقشوں کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں جو اس نے اپنی راحت اور کامیابی کے لیے بڑی سوچ بچار اور بڑی کوششوں سے بنائے تھے پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی اتفاقات انسان کو ایسی کامیابیوں سے ہمکنار کر دیتے ہیں، جن کے حصول میں فی الواقع اس کی اپنی کوشش کا ذرہ بھر بھی عمل دخل نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں بس ایک حد تک خود مختار ہے۔ مختارِ کل نہیں ہے۔ اب اس اختیار و اضطرار کی حدود مقرر کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ سوال درحقیقت یوں بنتا ہے کہ اس کائنات میں خالقِ کائنات کا دستورِ اساسی کیا ہے؟ اور اس میں کچھ انسان کا حصہ بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کتنا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ یہ بات انسان کی عقل و فہم سے بالاتر ہے۔

افعال کی نسبت

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ انسان کے بعض افعال کی نسبت قرآن کریم میں بعض مقامات پر بندے کی طرف کی گئی ہے اور بعض مقامات پر خدا کی طرف خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے ہوں۔ پھر کبھی بُرے افعال کی نسبت خود انسان یا شیطان کی طرف کی گئی ہے اور اچھے اعمال کی خدا کی طرف تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی ایک فعل کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سبب کی طرف نسبت کر دی جائے تو وہ نسبت ٹھیک ہی سمجھی جاتی ہے مثلاً ایک

بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو یوں بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے فلاں ملک فتح کیا۔ اور یوں بھی کہ فوج نے ملک کو فتح کیا۔ اور یوں بھی کہ فلاں فلاں نامور افراد نے اس ملک کو فتح کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب یہ ایک ایسا مربوط سلسلہ ہے کہ اس میں کسی ایک کا حصہ معین نہیں کیا جا سکتا۔ بعینہ یہی صورت حال انسان کے افعال کی ہے۔ اب ان کی مثالیں دیکھیے۔

۱۔ انسان کے اچھے اعمال کی نسبت انسان کی طرف :۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ (۳/۵۷)

(اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے ان کو اللہ پورا پورا بدلہ دے گا)

۲۔ انسان کے اچھے اعمال کی نسبت خدا کی طرف :۔

اِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۲/۱۴۲)

(وہ اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلاتا ہے)

۳۔ انسان کے برے اعمال کی نسبت انسان کی طرف :۔

وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴/۷۹)

(اور جو برائی تجھے پہنچے تو وہ تیری شامت اعمال کی وجہ سے ہے۔)

۴۔ انسان کے برے اعمال کی نسبت شیطان کی طرف :۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (۲/۲۶۸)

(شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا اور بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے)

۵۔ انسان کے برے اعمال کی نسبت خدا کی طرف :۔

اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا (۴/۸۸)

(کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے اسے راستے پر لے آؤ)

۶۔ اچھے اور برے اعمال کی نسبت انسان کی طرف :۔

اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵/۲۸)

(جو کچھ تم کرتے ہو آج تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا)

۷۔ اچھے اور برے اعمال کی نسبت خدا کی طرف :۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (۳۷/۲۹)

(اور اللہ نے ہی تمہیں پیدا کیا اور اس کو بھی جو تم کام کرتے ہو)

چونکہ انسان کے کسی عمل یا فعل میں ان مختلف عوامل کے کارکردگی کے حصے متعین

کرنا انسانی عقل کے احاطہ و ادراک سے باہر ہے۔ جیسا کہ ہر دور کے علماء اور مفکرین اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہے ہیں۔ اسی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ تقدیر کو زیر بحث لانے اور عقلی دلائل سے حل کرنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ قضا و قدر کا سوال حقیقت میں یہ سوال ہے کہ خداوند عالم کی سلطنت کا دستورِ اساسی کیا ہے؟ ایک مرتبہ صحابہ آپس میں مسئلہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور یہ باتیں سن کا آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا آپ نے فرمایا۔

"کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے۔ کیا اسی لیے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں ہلاک ہوئیں، میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو" (مشکوٰۃ، کتاب الایمان - الفصل الثانی)

ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا:۔

"جو شخص تقدیر کے بارے میں گفتگو کرے گا قیامت کے دن اس سے سوال کیا جائے گا۔ جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا" (مشکوٰۃ۔ حوالہ ایضاً)

ایک دفعہ آپ حضرت علیؓ کے مکان پر رات کو تشریف لے گئے اور پوچھا:
"تم لوگ (یعنی حضرت فاطمہؓ اور علیؓ) تہجد کی نماز کیوں نہیں پڑھتے؟" حضرت علیؓ نے جواب دیا۔

"یا رسول اللہؐ! ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ چاہے گا کہ ہم اُٹھیں تو اُٹھ جائیں گے" یہ سن کر حضور فوراً واپس ہو گئے اور اپنی ران پر ہاتھ مار کر فرمایا:

"وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴)

(انسان اکثر باتوں میں جھگڑالو واقع ہوا ہے") بخاری، کتاب التہجد، باب تحریض النبی علی قیام اللیل) اس حدیث سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ انسان عموماً ایسی "جبریت" کا اس وقت سہارا لیتا ہے، جب وہ اپنے میں کچھ کمی یا قصور دیکھتا ہے۔

۲۔ اپنے قصور کو مان لینے کے بجائے اسے کسی دوسرے کے سر تھوپنا ہی جھگڑے اور فساد کی بنیاد ہوتی ہے۔

۳۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کے جواب کی تردید نہیں فرمائی۔ بلکہ آپ کی ناراضی کی

وجہ یہ تھی کہ جو قوتِ اختیار و ارادہ اس معاملہ میں حضرت علی کو حاصل تھا۔ اس کی انھوں نے نفی کر دی تھی۔ حالانکہ انسان کے سب افعال میں خدا کے ساتھ انسان کا بھی اشتراک ہے۔

لیکن افسوس کہ حضور اکرمؐ کے ایسے واضح احکامات کے باوجود دوسری قوموں کے مسائل فلسفہ و طبیعات کا مطالعہ کرنے سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی داخل ہو گیا۔ اور اس کثرت سے اس پر بحث کی گئی کہ آخر کار یہ مسئلہ اسلامی علمِ کلام کے مہماتِ مسائل میں شمار ہونے لگا۔

تاویلات | جیسا کہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ قرآن کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جن سے انسان کے مکمل صاحب اختیار ہونے کا پہلو نکلتا ہے۔ اور ان سے جبر کا پہلو نکالنا ممکن نہیں۔ لیکن جبریہ حضرات اور جہمیہ ان آیات کی بھی ایسی دور از کار تاویلات پیش کرتے ہیں۔ جنھیں عقلِ سلیم تسلیم کرنے سے ابا کرتی ہے۔ اور ان تاویلات سے بھی وہ شخص تو شاید مطمئن ہو سکے جو پہلے سے ہی ایسا نظریہ قائم کر چکا ہو۔ لیکن جس شخص کو قرآن سے رہنمائی حاصل کرنا مقصود ہو۔ اس کے لیے تو ایسی تاویلات رہنمائی کے بجائے شدید الجھن کا باعث بن جاتی ہیں۔ یہی حال ایسی آیات کی تاویل کا ہے۔ جو انسان کو مجبور بتلاتی ہیں اور ان سے اختیار کا پہلو نکالنا مشکل سا معاملہ بن جاتا ہے لیکن قدریہ ان کی ایسی ہی تاویلات کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں فرقوں کی تاویلات نے خود قرآن کریم کو ہی تضادات کا گورکھ دھندا بنا کے رکھ دیا۔

عدل یا قانونِ جزا و سزا

قانونِ جزا و سزا یہ ہے کہ انسان اپنے کسی فعل یا عمل میں جس قدر مختار ہوتا ہے اسی حد تک وہ اس کا ذمہ دار ہے اور جہاں سے اضطرار کی کیفیت شروع ہوتی ہے اس سے جزا و سزا کی تکلیف اس سے اٹھا لی جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کوئی شخص اگر آپ کو گالیاں دے تو آپ اس کو جواب میں یا تو گالی دیں گے یا پتھر ماریں گے یا کم از کم سخت سُست ہی کہیں گے۔ لیکن اگر وہی گالی دینے والا شخص دیوانہ ہو تو آپ اسے معذور سمجھیں گے اور اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ سو دیکھیے مندرجہ ذیل آیات کس خوبی سے اس بات کی وضاحت پیش کر رہی ہیں۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ

اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے کوشش کی۔ اور بلاشبہ اس کی کوشش کو دیکھا

يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ (۵۳/۴۱) جائیگا۔ پھر اس کا پورا پورا بدلہ اس کو دیا جائیگا۔

یعنی کسی انسان کے عمل میں انسان کا جتنا حصہ ہے صرف اسے دیکھا جائے گا پھر اسے اس کے مطابق بدلہ دیا جائیگا۔ نہ کم نہ زیادہ بلکہ اس کا پورا پورا بدلہ۔ یہیں سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ حقیقی عدل کرنے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا جو اعمال کی قدر و قیمت اس کی جزا کا حساب رکھ سکے اور دوسرا یہ کہ حقیقی عدل کے قیام کے لیے اخروی زندگی اور اس پر ایمان لانا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اگر ایسا حقیقی عدل اسی دنیا میں ہی ملنا شروع ہو جاتے تو دنیا سے نوعِ انسانی تو درکنار ہر جاندار چیز کا خاتمہ ہی ہو جائے بموجب ارشاد باری تعالیٰ :-

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ (۳۵/۴۵) اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

۲۔ صفاتِ باری تعالیٰ

معتزلہ کی توحید

اور "اہلِ توحید" کے لفظ سے معتزلہ اپنے اس مخصوص عقیدے کی وضاحت کرتے تھے جو ارسطو نے پیش کیا تھا۔ اور بڑے طمطراق سے یہ دعوے کرتے تھے کہ وہ توحید خالص کے قائل ہیں اور باری تعالیٰ کو ہر قسم کے شرک سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ باری تعالیٰ یکتا ہے قدیم ہے۔ اس معاملے میں کوئی دوسری صفت یا چیز اس کی شریک و سہیم نہیں اور اگر اس کی صفات بھی اسی کی طرح ازلی و ابدی مان لی جائیں۔ تو تعدد قدما لازم آتا ہے۔ جو شرک ہے۔ چنانچہ یہ لوگ خدا کی صفات مثلاً علم قدرت حیات، سمع و بصر وغیرہ کو ان معنی میں مانتے تھے۔ کہ وہ فی ذاتہٖ قادر، حی، سمیع و بصیر ہے۔ اس کی کوئی صفت اس کی ذات پر الگ یا زائد نہیں۔

اب ظاہر ہے کہ خدا کے متعلق ایسے تجریدی تصور کا جس میں خدا کی حیثیت ریاضی کے ایک کلیہ کی سی رہ جاتی ہے جس کے مطابق ہر سبب لازمی طور پر ایک نتیجہ برآمد کرتا ہے اور علت و معلول کا یہ بے جان اور ارادہ و اختیار سے یکسر عاری نظام اس کائنات کو میکانکی طور پر چلا رہا ہے۔ اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام میں خدا کی ذات ستودہ صفات ہے۔ جس کی زندگی میں حرارت ہے اور کائنات سے گہری محبت

رکھتا ہے۔ جو صاحب ارادہ ہے وہ علیم و بصیر ہے اور کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے نہ صرف اسے وہ اچھی طرح دیکھتا اور جانتا ہے۔ بلکہ اس کی براہِ راست نگرانی کر رہا ہے۔ انسان جب تک ایسی حیّ و قیوم ہستی پر ایمان نہیں لاتا اس وقت تک اسے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ ریاضی کے لگے بندھے فارمولوں اور علّت و معلول کی بے جان کڑیوں یا مجرّد تصور سے اخلاق و روحانیت کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ گویا معتزلین نے ایک طرف تو خدا کو معطل بنا دیا اور دوسری طرف انسان کو مکمل خود مختار بنا دیا۔

معتزلہ کے یہ عقائد ہر چند گمراہ کن تھے اور مسلمانوں کی اکثریت نے ان کو مردود قرار دے دیا تھا تاہم ایک وجہ ایسی پیدا ہو گئی جو معتزلہ کی شہرتِ دوام کا باعث بن گئی۔ عباسی خلیفہ منصور (۱۳۴ - ۱۵۸ھ) واصل بن عطاء سے متاثر تھا۔ اس لیے واصل بن عطاء کو بڑا بلند مرتبہ حاصل تھا) تاہم خلیفہ منصور نے یہ خیالات اور عقائد اپنی ذات تک محدود رکھے اور ان کو رعایا پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کی۔ یہ عقائد عباسی خلفاء میں پرورش پاتے رہے۔ ہوتے ہوتے جب مامون الرشید کا دور (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) آیا تو ان عقائد نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ کیونکہ مامون خود پکا معتزلی تھا۔ اور اس نے یہ عقائد بہ جبر مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔

مسئلۂ خلقِ قرآن

مشہور مسئلہ خلقِ قرآن اسی کے دور کی پیداوار ہے۔ یہ مسئلہ در اصل معتزلہ کے متعلق تجریدی تصور کا ایک حصہ تھا۔ وہ خدا کی دوسری صفات کی طرح بولنے اور کلام کرنے کی صفت کو بھی حادث سمجھتے تھے۔ لہذا قرآن کو قدیم کی بجائے حادث یا مخلوق تسلیم کرنا لازم آتا تھا۔ خلقِ قرآن کے مسئلہ میں مامون الرشید عام معتزلیہ سے بھی چار قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ علماء اور جمہور اسلام نے مامون کو بدعتی کہنا شروع کر دیا تھا تو اس سے وہ اور بھی متشدد ہو گیا۔ اس نے حاکم بغداد اسحٰق بن ابراہیم کو فرمان بھیجا کہ :-

۱- جو لوگ قرآن کو غیر مخلوق سمجھتے ہیں ان کو سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔
۲- ان کی شہادتیں ناقابلِ اعتماد قرار دی جائیں اور
۳- دار الخلافہ کے ممتاز علماء کے خیالات درباۂ خلقِ قرآن قلمبند کر کے میرے پاس بھیجے جائیں۔

چنانچہ حاکمِ بغداد نے بیس علماء کے بیانات درج کر کے خلیفہ کو بھیجے۔ جن میں سے اکثر علماء نے معتزلی عقائد کی صریحاً نفی کی تھی۔ کچھ نے گول مول جواب دیا۔ مامون ان بیانات پر سخت برہم ہوا۔ اور حکم دیا کہ جو لوگ قرآن کو مخلوق نہ مانیں انہیں فوراً گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دیا جائے۔

امام احمد بن حنبلؒ بہ فرمانِ شاہی سُن کر کم و بیش سب علماء نے اپنی جان بچانے کی خاطر قرآن کو مخلوق کہہ دیا۔ صرف چار علماء امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن نوحؒ، قواریری وغیرہ اپنے اصلی مسلک پر قائم رہے۔ اسحاق حاکمِ بغداد نے انہیں بوجھل بیڑیاں پہنا کر بغداد کی طرف روانہ کر دیا۔

مقامِ حیرت ہے کہ مامون جیسا عالی ظرف اور متحمل مزاج انسان اس مسئلہ پر اتنا تنگ خیال اور متعصب ثابت ہوا اور ایک فلسفیانہ خیال کے پیچھے لگ کر اور اس سوال کو مذہبی رنگ دے کر خواہ مخواہ اُمت میں انتشار پیدا کر دیا۔ وہ قرآن کو غیر مخلوق سمجھنے والوں کو مشرک سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے کئی علماءِ حق کو اپنے ہاتھ سے اسی مسئلہ کی وجہ سے تہ تیغ کر کے دار السلطنت کی گلیوں کو رنگین کر دیا۔ جب اسے ان چار آدمیوں کے قافلہ کی روانگی کا علم ہوا۔ تو یک دم جوش و غضب سے بھر گیا۔ وہ اپنی تلوار ہوا میں لہراتا اور قسم کھا کر کہتا تھا کہ میں ان لوگوں کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔

سرکاری خدام میں سے ایک شخص امام احمد بن حنبل کا دل سے معتقد تھا۔ وہ کسی طرح اس قافلے کو جا کر ملا اور امام احمد بن حنبلؒ سے صورتِ حال بیان کی۔ امام صاحب کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ البتہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے رحم و مغفرت کی دعا فرمائی۔ وہ مستجاب ہوئی۔ مامون پر تپ لرزہ کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ ہزار کوشش کے باوجود جانبر نہ ہو سکا۔ یہ قافلہ ابھی راستہ ہی میں مقام رقہ پر پہنچا تھا کہ مامون کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اور یہ لوگ واپس بغداد بھیج دیے گئے۔

امام موصوف پر دورِ ابتلاء مامون کے بعد اس کا بھائی معتصم باللہ (۲۱۸-۲۲۷ھ) تخت نشین ہوا۔ یہ شخص گو علم و ادب سے بیگانہ تھا مگر معتزلی عقائد میں اپنے پیش رو سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اس کے عہد کا افسوسناک واقعہ یہ ہے۔ کہ اس نے کئی بار امام صاحب کو کوڑوں سے پٹوایا عموماً روزانہ دس کوڑوں کی سزا دی جاتی۔ اس سے بعض دفعہ امام صاحب بے ہوش بھی ہو جاتے۔ انہی دنوں کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک ڈاکو ابو الہیثم نے بڑی کوشش سے امام احمدؒ سے تنہائی میں ملاقات کی اور آپ سے پوچھا کہ آپ کو یقین ہے کہ آپ حق پر ہیں؟ امام احمدؒ نے فرمایا: میں پورے

وثوق سے کہتا ہوں کہ میں حق پر ہوں۔" ابو الہیثم کہنے لگا۔ مجھے دیکھیئے ! ساری عمر ڈاکہ زنی میں گزری۔ کئی ڈاکے ڈال چکا ہوں اور کئی مرتبہ گرفتار رہا۔ آج تک اٹھارہ سو کوڑے کھا چکا ہوں۔ لیکن کبھی اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا اور آپ تو حق پر ہیں۔ لہذا کوڑوں کے ڈر سے آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنی چاہیئے۔" امام صاحب زندگی بھر اس ڈاکو کو دعائیں دیتے رہے۔ جس نے ایسے نازک وقت میں ان کے پائے ثبات کو مزید استحکام بخشا۔

امام صاحب کی سزا اور موت کا مسئلہ دراصل ان کی ذات تک محدود نہ تھا۔ عوام الناس کو امام موصوف سے گہری عقیدت تھی۔ لہذا حکومت انہیں قتل کرکے بغاوت کا خطرہ مول نہ لے سکتی تھی۔ اور سزا کو قید خانہ اور کوڑوں تک محدود رکھتی تھی۔ مشہور سرکاری اور معتزلی عالم احمد بن ابی داؤد کے امام موصوف سے مناظرے بھی کرائے جاتے اور جب ابن ابی داؤد امام صاحب کے دلائل سے لاجواب ہو جاتا تو بالآخر یہ کہہ کر خلیفہ کو ابھارتا تھا کہ یہ شخص بدعتی اور ہٹ دھرم ہے۔ ادھر عوام الناس کی نظریں امام احمدؒ پر جمی ہوئی تھیں۔ اگر امام صاحب اس مسئلہ میں تھوڑی سی بھی لچک پیدا کر لیتے تو لوگوں کی عام گمراہی کا بھی خطرہ تھا۔ لہذا وہ کوڑے کھاتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے۔ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق گویا یہ مسئلہ اب امام صاحب کی زندگی اور موت کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ تمام امت کی ہدایت و ضلالت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ اگر اس موقعہ پر امام صاحب ہار تسلیم کر لیتے تو اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ حکومت وقت عقائد اور دینی امور میں تغیر و تبدل کا حق رکھتی ہے۔ اور یہ بات امام صاحب کو قطعاً گوارا نہ تھی۔ نہ ہی امت کا اجتماعی ضمیر اس کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ صراحتاً نہیں تو باتوں باتوں میں لوگ خلیفہ تک اپنے خیالات کا اظہار کر بھی دیتے تھے۔

خلق قرآن کی حقیقت اور معتزلہ کا انجام معتصم کے بعد اس کا بیٹا واثق باللہ (۲۲۷-۲۳۲ھ) تخت و تاج کا وارث بنا۔ یہ معتزلہ عقائد کی اشاعت میں اپنے باپ سے بھی بڑھ گیا۔ اس کے دور میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دربار کا خاص مسخرا ایک دن خلیفہ کے سامنے آیا تو کہنے لگا۔" اللہ تعالیٰ امیر المومنین کو قرآن کے بارے میں صبر و جمیل کی توفیق بخشے۔"

واثق:" خدا تجھے سمجھے ! نالائق کیا قرآن کی وفات ہو گئی ہے؟"

مسخرا:" امیر المومنین ! آخر کیا چارہ ہے ہر مخلوق پر موت واقع ہونے والی ہے، اور قرآن بھی مخلوق ہے۔ آج نہیں تو کل یہ حادثہ ہو کر رہے گا۔"

مسخرے کے اس جواب پر واثق سوچ میں ڈوب گیا تو مسخرے نے دوسرا سوال کر دیا اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا:۔

"امیر المومنین! آئندہ لوگ نماز تراویح میں کیا پڑھا کریں گے؟" اس طنزیہ سوال نے واثق باللہ کو مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں گہری سوچ پر مجبور کر دیا۔ اب وہ اس مسئلہ پر متشدد نہ رہا تھا۔ اور اپنے طور پر "لا ادریت" کے مقام پر آ گیا تھا۔ کہ انھی دنوں ایک دوسرا واقعہ پیش آیا۔ ایک نامعلوم بزرگ آیا اور اس نے خلیفہ سے اس مسئلہ پر ابن ابی داؤد سے مناظرہ اور بحث کرنے کی اجازت طلب کی۔ خلیفہ نے اجازت دے دی تو اس سفید ریش بزرگ نے ابن ابی داؤد سے کہا۔

"میں ایک سادہ سی بات کہتا ہوں۔ جس بات کی طرف نہ خدا کے رسول نے دعوت دی نہ ہی حضرت ابوبکرؓ نے، نہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے تم اس کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو اور پھر منوانے کے لیے زبردستی سے کام لیتے ہو۔ اب دو ہی باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان جلیل القدر ہستیوں کو اس مسئلہ کا علم تھا لیکن انھوں نے سکوت فرمایا تو تمھیں بھی سکوت اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اگر تم کہو کہ ان کو علم نہ تھا تو گستاخ ابن گستاخ! ذرا سوچ جس بات کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو نہ ہوا۔ اس کا علم تمھیں کیسے ہو گیا؟"

ابن ابی داؤد سے اس کا کچھ جواب نہ بن پڑا۔ واثق باللہ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا، اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ زبان سے بار بار یہ فقرہ دہراتا تھا۔ "جس بات کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو نہ ہوا، اس کا علم تجھے کیسے ہو گیا؟" مجلس برخاست کر دی گئی۔ اس نے اس بزرگ کو عزت و احترام سے رخصت کیا اور اس کے بعد حضرت امام پر سختیاں بند کر دیں۔

غرض ایسے واقعات نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ ابن ابی داؤد لوگوں کی نظروں سے گر گیا۔ پھر جب واثق باللہ کے بعد اس کا بھائی متوکل باللہ (۲۳۲-۲۴۶ھ) تخت نشین ہوا تو اس نے امام موصوف کو باعزت طور پر رہا کر دیا۔ یہ معتزلہ عقائد سے بیزار اور متبع سنت خلیفہ تھا۔ اس طرح اعتزال سے جب حکومت کی پشت پناہی ختم ہوئی جو اس کا آخری سہارا تھا۔ تو یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔

۳۔ عقل کی برتری اور تفوق

اسلام میں جب بھی کسی گروہ نے اپنے تصورات و نظریات کو داخل کرنا چاہا تو

اس نے سب سے پہلے عقل کی برتری اور اس کی فرمانروائی کا چرچا کیا اور کہا کہ چونکہ مروجہ نظریات وخیالات و افکار ذہنِ انسانی سے مطابقت نہیں رکھتے اس لیے انہیں رد کر کے اس کی جگہ ایسے افکار ونظریات لانا ضروری ہے جو عقل کے عین مطابق ہوں۔ عقل سے مراد وہ نظریات مراد ہوتے ہیں جو اس دور کے غالب رجحانات کی عکاسی کریں۔ معتزلہ نے بھی یونانی افکار و نظریات سے ذہنی طور پر شکست کھا کر یہی کچھ کیا۔ اور عقل کی بنا پر زور دیا۔ کہ شریعت میں فیصلہ کن حیثیت رسول کی بجائے عقل کو حاصل ہو اور انہیں وہ سارے اعمال و تصورات شریعت سے خارج کرنے میں آسانی رہے جو ان کے زعم کے مطابق خلافِ عقل ہیں۔ چنانچہ معتزلہ نے اپنے مخصوص نظریات "عدل" اور "توحید" کی بنا پر پل صراط، میثاق اور معراج کا انکار کیا اور ان ساری احادیث کو رد کر دیا جن میں ان کا ثبوت ملتا ہے۔

عقل کی برتری اور تفوق ان کے عقیدہ کا جزوِ لاینفک تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے وہ فی نفسہٖ بری اور انسان کی نظروں میں ناپسندیدہ ہیں۔ اسی طرح جن چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے سو وہ اس لیے ہے کہ وہ چیزیں فی نفسہٖ اچھی ہیں اور انسانی عقل انہیں پسند کرتی ہے (تجدیدِ مذہب ص ۱۸۰)

عقل کا جائز مقام قرآن کریم میں بے شمار ایسی آیات وارد ہوئی ہیں۔ جن میں عقل انسانی سے اپیل کی گئی ہے جو وہ کائنات میں بکھری ہوئی لاتعداد اللہ کی نشانیوں میں غور وفکر کرے۔ کبھی انسان کی توجہ ہواؤں کی تصریف وتصرف کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ تو کبھی سورج، چاند اور ستاروں کی حرکات اور دن رات اور موسم کی تبدیلی کی طرف کبھی نباتات کی روئیدگی اور اس کی مختلف منازلِ حیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور کہیں حیوانات کی تخلیق اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد کی طرف، کبھی عالم آفاق میں قدرتِ الٰہی پر واضح شواہد کی طرف توجہ کی دعوت دی گئی ہے۔ تو کبھی انسان کے اپنے اندر کی دنیا کی طرف۔ غرض یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قرآن کریم کا ایک متعدد بہ حصہ ایسی آیات پر مشتمل ہے جن میں انسان کو اپنے اندر اور باہر کی دنیا میں سوچنے، غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ کس طرح نباتات کا پتہ پتہ، پھولوں کی پنکھڑی، شجر و حجر اور شمس و قمر شہادت دے رہے ہیں کہ وہ قدرت کے مختلف اسرار کا مجموعہ اور خالق کائنات کے علم و حکمت کے واضح شواہد ہیں۔ اس غور وفکر سے انسان کو دو طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ پہلا یہ کہ انسان ان کے خواص و تاثیرات معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمایا کہ :۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۴۵/۲۰) — جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تمہارے قابو میں کر دیا ہے ۔

یعنی کائنات کی ہر چیز کو تمہارا تابع فرمان بنا دیا گیا ہے ۔ اب اسے کام میں لانا انسان کا اپنا کام ہے ۔ اور فائدہ غور و فکر اور عقل کو کام میں لانے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

۲۔ جب انسان اشیائے کائنات کا تحقیق و تدقیق سے مطالعہ کرتا ہے اور ان میں غرق ہو کر ان کے پوشیدہ اسرار و رموز اور حکمتوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے تو یہ باتیں اسے خود خالقِ کائنات کے وجود اور اس کے محیر العقول علم و حکمت کی طرف واضح نشاندہی کرتی ہیں اور بے اختیار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں :۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۱) — اے پروردگار! تو نے اس کائنات کو عبث نہیں پیدا کیا ۔

عقل اور ہدایت

آیاتِ الٰہی سے مندرجہ بالا نتائج ماخوذ کرنے کی تائید میں ہم یہاں ایک واقعہ درج کرتے ہیں ۔ جو علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کو اس دوران پیش آیا جب وہ انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے ۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔

"۱۹۰۹ء کا ذکر ہے اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی ۔ میں کسی کام سے باہر نکلا ۔ تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہرِ فلکیات پروفیسر جیمس جینز بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے ۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا ۔ تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا "دو باتیں" پہلی یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے ۔ سر جیمس جینز اس بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتہ تان لیا ۔ پھر میں نے کہا ۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے ؟" میرے اس سوال پر پروفیسر جیمس جینز لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا :۔

"آج شام میرے ساتھ چائے پیو"

چنانچہ میں ۴ بجے شام کو ان کی رہائش گاہ پر پہنچا ۔ ٹھیک چار بجے لیڈی جینز باہر آ کر کہنے لگیں "سر جیمس تمہارے منتظر ہیں" اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی

تھی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "تمہارا سوال کیا تھا؟" اور میرے جواب کا انتظار کیئے بغیر، اجرامِ سماوی کی تخلیق، اس کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پنہائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں، نیز باہمی روابط اور طوفان ہائے نُور پر ایمان افروز تفصیلات پیش کیں۔ کہ میرا دل اللہ کی اس کبریائی وجبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی یہ کیفیت تھی کہ سر کے بال سیدھے اُٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت وخشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت ودانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے۔ اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے "عنایت اللہ خان! جب میں خدا کی تخلیق کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب میں کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں "تو بہت بڑا ہے" تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے۔ مجھے بیحد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے۔ کہو عنایت اللہ خاں! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں کیوں گرجے جاتا ہوں؟"

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا "جناب والا! میں آپ کی رُوح پرور تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ایک آیت یاد آگئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں؟" فرمایا! "ضرور!" چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۳۵: ۲۷-۲۸)	اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں اور بعض کالے سیاہ ہیں۔ انسانوں جانوروں اور چوپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں۔ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحبِ علم ہیں۔

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:۔

"کیا کہا؟ اللہ سے صرف اہلِ علم ڈرتے ہیں؟" حیرت انگیز، بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ سے معلوم ہوئی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ بات موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اَن پڑھ تھے۔ انہیں یہ حقیقت

خود بخود نہ معلوم ہو سکتی تھی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے انھیں بنائی تھی بہت خوب! بہت عجیب[۱]"
یہ ہیں وہ نتائج جو اشیائے کائنات میں غور و خوض کرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں اور جن کی طرف قرآن نے ہر شخص کو دعوت دی ہے۔ اب اس کے برعکس ایک دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

عقل اور ضلالت

سر چارلس ڈارون (۱۸۰۸ - ۱۸۸۲ء) وہ پہلا مغربی مفکر ہے جس نے انسان کی تخلیق کے مسئلہ میں نظریۂ ارتقاء کو باضابطہ طور پر پیش کیا وہ کہتا ہے آج سے ۲ ارب سال پیشتر سمندر کے ساحل کے قریب پایاب پانی کی سطح پر کائی نمودار ہوئی۔ پھر اس کائی کے کسی ذرہ میں کسی نہ کسی طرح" حرکت پیدا ہوئی تھی یہی اس دنیا میں زندگی کی پہلی نمود تھی۔ اسی جرثومۂ حیات سے بعد میں نباتات اور اس کی مختلف شکلیں وجود میں آئیں۔ پھر حیوانات وجود میں آئے اور بالآخر بندر کی نسل سے انسان پیدا ہوا ہے۔

ڈارون کی تحقیق و تدقیق اپنے مقام پر بجا اور درست۔ یہ صحیح ہے یا غلط یہ ہم کسی اور مقام پر زیر بحث لائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈارون پر اس تحقیق و تدقیق کا یہ اثر ہوا کہ وہ بالآخر خدا کا منکر ہو کر مرا تھا۔ ابتداءً وہ خدا پرست تھا۔ پھر جب اس نے یہ نظریہ مدلل طور پر پیش کیا تو لاادریت کی طرف مائل ہو گیا اور بالآخر خدا کی ہستی سے یکسر انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے اس نے یوں کہا تھا۔ کہ اس کائی میں کسی نہ کسی طرح" زندگی پیدا ہو گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس وقت خدا کی ہستی کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار تھا ان ہر دو واقعات سے ہم ان نتائج تک پہنچتے ہیں کہ:-

(۱) اگر عقل وحی کے تابع ہو کر چلے تو یہ خالق کائنات پر بے پناہ ایمان و یقین کا سبب بنتی ہے

(۲) اگر عقل وحی سے بے نیاز ہو کر چلے تو بسا اوقات ضلالت و گمراہی کی انتہائی پہنائیوں میں جا گرتی ہے۔

یہیں سے عقل اور وحی کے مقامات کا تعین ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عقل انتہائی محدود ہے۔ اور یہ کائنات لامحدود ہے۔ لہٰذا اس کائنات کی ہر ایک چیز کی حقیقت کا ادراک اس عقلِ ناتمام کے بس کا روگ نہیں۔ عقل کی مثال آنکھ کی طرح ہے اور وحی وہ خارجی روشنی ہے۔ جس کی موجودگی میں عقل صحیح راستہ پر چل سکتی ہے۔ وحی خالق کائنات ہی علم و حکمت کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اشیائے کائنات کی

---

[۱] علم جدید کا چیلنج ۔ مؤلفہ وحید الدین خاں ۔ ص ۲۱۵ تا ۲۱۶

حقیقت کا علم خالقِ کائنات سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ لہٰذا جو عقل وحی کی روشنی سے بے نیاز ہو کر اپنا راستہ تلاش کرے گی وہ ہمیشہ تاریکیوں میں ہی بھٹکتی رہے گی۔ اور یہی کچھ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک عقل اور اہل عقل کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اس عقل کو، جو وحی کی روشنی سے فائدہ نہیں اٹھاتی حیوانی سطح کی عقل سے بھی فروتر قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲)	یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹)	اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چارپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس آیت کا ابتدائی حصہ بتا رہا ہے۔ کہ اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو وحی الٰہی پر ایمان نہیں لاتے ان کی عقل محض حیوانی سطح پر ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم تر۔ کیونکہ وہ عقل و شعور رکھنے کے باوجود وحی کی روشنی سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

عقل کا دائرہ کار | بلاشبہ دین کے انتخاب کے بارے میں عقل کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اس کے اصول و مبادیات کی جانچ اور تحقیق کرے۔ پھر چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو رد کر دے۔ کیونکہ دین کے اختیار کرنے میں کوئی مجبوری نہیں لیکن دین کو قبول کرنے کے بعد عقل کو ہرگز یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ اس کے اہم اور بنیادی عقائد و نظریات جو وحی کی صورت میں اسے ملے ہیں پر ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دے بلکہ اسے اب وحی کے تابع ہو کر چلنا چاہیے اور یہ اتباع اندھی عقیدت کے طور پر نہیں بلکہ علی وجہ البصیرت ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہمارے خیال میں عقل کے کام مندرجہ ذیل قسم کے ہونے چاہئیں۔

(۱) وحی کے بیان کردہ اصول و احکام کے اسرار اور حکمتوں کی توضیح و تشریح۔

(۲) احکام کے نفاذ کے عملی طریقوں پر زمانہ کے حالات کے مطابق غور کرنا اور پیش آمدہ رکاوٹوں کو دور کرنا۔ مثلاً وحی نے اگر سُود کو حرام کر دیا ہے تو عقل کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وحی کی حدود کے اندر اس کو ختم کرنے کے لیے حل پیش کرے۔ پھر اگر عقل سُود یا اس کی بعض شکلوں کو حرام سمجھنے کے بجائے اس کو حلال بنانے کے حیلے سوچنے لگے۔ تو عقل کے استعمال کا یہ رُخ قطعاً صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ نص یا کتاب و سنت کے واضح احکام کی موجودگی میں اجتہاد یا بالفاظِ دیگر عقل کا استعمال قطعاً حرام ہے۔

(۳) موجودہ دَور کے نظریات کے مقابلہ میں وحی کے نظریات کی برتری ثابت کرنا۔ اور ان کو مدلّل طور پر پیش کرنا۔ اور اگر موجودہ نظریات سے عقل خود مرعوب ہو کر وحی ہی کانٹ چھانٹ اور اس کی دور از کار تاویلات کر کے اس کے واضح مفہوم کو بگاڑنے کی کوشش کرے گی تو اس کا یہ کام دین میں تحریف شمار کیا جائے گا۔

(۴) تحریف شدہ ادیان پر اسلام کی برتری اور فوقیت کو دلائل سے ثابت کرنا اور بیرونی حملوں کا دفاع کرنا۔

(۵) انفس و آفاق کی ان آیات جن میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ان میں تحقیق و تفتیش کر کے انہیں آگے بڑھانا اور ان سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنا جن کی پہلے وضاحت کی جا چکی ہے۔

یہ اور اس جیسے کئی دوسرے کام ہیں جن میں عقل سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ اعلان کر دیجئے کہ:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

کہہ دیجئے کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اور میرے پیروکار خدا کی طرف سمجھ بوجھ کی بنیاد پر دعوت دیتے ہیں اور اللہ پاک ہے۔ اور میں مشرکوں سے نہیں۔

عقل کی ناجائز مداخلت

پھر وہ لوگ جو ذہنی طور پر جدید فلسفہ یا سائنسی نظریات سے مرعوب ہو جاتے ہیں، محض اس لیے کہ وحی اس کے ہمنوا نہیں ہوتی۔ تو وہ وحی سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۱۰/۳۹)

بلکہ جس چیز کے علم پر یہ قابو نہ پا سکے اس کو جھٹلا دیا۔ حالانکہ ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی ہی نہیں اسی طرح ان سے پہلے لوگ بھی جھٹلاتے رہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے نظریات ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ ایک دور میں ایک نظریہ قبول عام کا شرف حاصل کرتا ہے تو تھوڑی مدت کے بعد اس تردید شروع ہو جاتی ہے پھر ایک تیسرا نظریہ سامنے آتا ہے۔ اب تبلائیے کہ وحی آخر کون سے نظریہ کا ساتھ دے ؟ اور کیا باقی ادوار میں اس کو جھٹلا دیا جائے ؟ اس بات کو ہم ایک مثال سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ساتویں صدی قبل مسیح تک یہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ زمین ساکن ہے۔ اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ یونان کے ایک مفکر فیثا غورث (۵۹۰ ۔ ق م) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے جو سورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہے اور سورج اپنی جگہ پہ ساکن (ثابت ہے) فیثا غورث کا یہ نظریہ یونان میں اتنا مقبول ہوا کہ اس کی باقاعدہ درس و تدریس شروع ہو گئی۔ بعد ازاں چوتھی صدی ق م میں یونان ہی کے ایک دوسرے مفکر بطلیموس نے اس نظریہ کی تردید کی۔ بطلیموس علم ہندسہ، ہیئت اور نجوم میں یکتائے روزگار تھا۔ اور اس نے اجرام فلکی کی تحقیقات کے لیے ایک رصد بھی تیار کی تھی۔ بطلیموس کے نظریہ کے مطابق مزید کو ساکن اور مرکز چار کرے، اور سات آسمان اور ان پر سات سیارے، آٹھواں فلک ثوابت، آسمان کے بارہ برج یہ سب اسی نظریہ کے اجزاء ہیں۔ بطلیموس کے پیش رو ارسطو اور برخس بھی اسی نظریہ کے قائل تھے۔ بطلیموس کا نظریہ چار دانگ عالم میں بہت مشہور ہوا۔ مصر، یونان، ہند اور یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی تک اسی نظریہ کی تعلیم دی جاتی رہی اور ۱۸۰۰ سو سال تک یہ نظریہ دنیا بھر میں مقبول رہا۔ جب قرآن نازل ہوا تو اس وقت یہی نظریہ درست سمجھا جاتا تھا۔ بعد ازاں کوپرنیکس (۱۴۷۳۔ ۱۵۴۳ء) نے سولہویں صدی عیسوی میں زمین کی محوری گردش کا بھی اور سورج کے گرد سالانہ گردش کا بھی تصور پیش کیا بعد ازاں ایک اور ہیئت دان ٹیکو براہی نے کوپرنیکس کے نظریہ کو رد کر دیا اور کوپرنیکس کے نظریہ کی حمایت کی پہلے نظریہ بطلیموس کو صحیح قرار دیا۔ بعد ازاں اٹلی کے ایک مفکر گیلیلیو (۱۵۶۴ ۔ ۱۶۴۲ء) نے زمین کو مرکز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کوپرنیکس کے نظریہ کی حمایت کی چنانچہ پادریوں نے اسے مذہب کے خلاف مسائل قرار دے کر اسے مجرم گردانا اور وہ جیل میں ڈال دیا گیا۔ پھر ایک سال بعد رہائی ہوئی۔ بعد ازاں سر آئزک نیوٹن (۱۶۴۲ ۔ ۱۷۲۷ء) نے کوپرنیکس کے نظریہ کو درجہ تحقیقات پہ پہنچایا۔ چنانچہ آج دنیا بھر میں یہی نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو فیثا غورث کے نظریہ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ فیثا غورث نے جہاں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ

سورج ساکن (ثابت سیارہ) ہے اور ہماری زمین اور کئی دوسرے سیارے اس کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ وہاں اس نے یہ نظریہ بھی پیش کیا تھا۔ کہ اس وسیع کائنات میں سورج کی طرح کے اور بھی کئی سیارے موجود ہیں۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ یہ ثابت سیارے بھی اپنے خاندان سمیت کسی بہت بڑے ثابت سیارے (ثابت الثوابت یا شمس الشموس) کے گرد چکر کاٹ رہے ہوں چنانچہ موجودہ دور کے ہیئت دانوں سے بھی اسی قسم کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

اب دیکھیے قرآن کریم میں ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۶/۳۸) اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے (فتح محمد جالندھری)
اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ رہا ہے (تفہیم القرآن)

لہٰذا جدید نظریات صرف اسی صورت میں قابلِ قبول سمجھے جائیں گے جبکہ وہ وحی سے مطابقت رکھتے ہوں۔ بصورتِ دیگر ان نظریات کا یا تو بہ دلائل بطلان کرنا چاہیے یا ان کی ایسی معقول توجیہ پیش کرنی چاہیے جس سے قرآنی ارشادات پر حرف نہ آئے مثلاً سورج کی اپنے گرد محوری گردش یا کسی دوسرے بڑے ثابتہ کے گرد گردش۔ دونوں صورتوں میں سورج کی حرکت ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جبکہ یہ نظریہ وحی کے مطابق ہو جائے اور بالآخر یہ نظریہ سائنٹیفک تحقیقات کے کے بعد وحی کے مطابق ہونا لازم ہے۔ کیونکہ وحی ایک حقیقت ہے اور نظریات انسان کی محدود عقل کا کرشمہ۔ اور یہی لَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ کا صحیح مطلب ہے۔

اپنے دَور کی علمی سطح بعض لوگ انہی جدید نظریات سے مرعوب ہو کر قرآن کریم میں تاویل و تحریف یا نئی تعبیر پیش کر کے بزعم خود قرآن کریم کو اپنے علمی دَور کی سطح کے مطابق" لانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی دینی خدمت نہیں ہوتی بلکہ اس سے الحاد اور ذہنی انتشار کی راہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ہر دور کے مفکر قرآن کو اپنے اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق لا کر نئی نئی تعبیریں پیش کرنے لگ جائیں تو قرآن کے معانی و مطالب کا جو حشر ہو گا۔ اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

معتزلین کسی سائنسی نظریہ سے نہیں بلکہ یونانی فلسفہ سے شدید متاثر تھے ایک انگریز مصنف ان کے متعلق لکھتا ہے۔

"معتزلہ کی عقلیت کا اسلام کے نظامِ فکر میں جذب ہونا دشوار تھا۔ اگر اعتزال

کی تحریک کامیاب ہو جاتی تو اسلامی ثقافت انتشار اور برہمی کا شکار ہو جاتی۔ اور اسلام کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ ان کی علمی کاوشوں نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بھی کسی حد تک اپنا ہمنوا بنا لیا تھا لیکن جب معتزلہ کی انتہا پسند جماعتوں نے اسلامی عقائد کو یونانی تصورات کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ اور قرآن کریم کی بجائے اپنے دینی عقائد یونانی فلسفہ سے اخذ کرنا شروع کیے تو آخر الذکر طبقہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔" (ماخوذ۔ از ایچ۔ اے۔ آر۔ گب)

معتزلہ کے زوال کے اسباب

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اعتزال کا فتنہ محض دولتِ عباسیہ کی پشت پناہی کے سہارے تقریباً سوا سو سال تک زندہ رہا۔ ورنہ امت کا اجتماعی ضمیر دین کے سادہ اصولوں کے مقابلہ میں ایسے فلسفیانہ عقائد کو گوارا کرنے کے لیے کسی وقت بھی تیار نہ ہوا۔ تاہم بنظر غائر دیکھا جائے تو اس فرقہ کے زوال کے درج ذیل اسباب نظر آتے ہیں۔

(۱) محدثین کرام کا زبردست تحقیقی کام۔ جس نے مسلمانوں کے تمام سوچنے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا۔ کہ رسول اللہ کی سنت جن روایات سے ثابت ہے وہ ہرگز مشتبہ نہیں بلکہ نہایت معتبر ذرائع سے امت کو پہنچی ہیں۔ اور ان کو مشتبہ روایات سے الگ کرنے کے بہترین علمی ذرائع موجود ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جہم و اعتزال اور خوارج کے فتنوں، وضعی روایات کی کثرت اور انکارِ حدیث کے عام میلان نے ہی علمائے دین کو احادیث کی تحقیق اور چھان پھٹک، راویوں پر جرح و تعدیل کے فن کو وجود میں لانے کی ضرورت کا شدید احساس دلایا۔ بمصداق ؎

عدو شرّے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

فن رجال کے امام اور معتبر مورخین نے اسی تیسری صدی ہجری میں اپنے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ جن کی بنا پر امت نے وضعی روایات اور غیر اسلامی نظریات کو علی وجہ البصیرت رد کر دیا۔

۲۔ علمائے دین نے قرآن کی ہی تصریحات سے یہ ثابت کر دیا کہ رسول اکرم کی حیثیت محض ایک "نامہ بر" کی نہیں تھی۔ جیسا کہ یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ آپؐ کو خدا نے معلم

لہ جبکہ طلوع اسلام معتزلین کے متعلق یوں لکھتا ہے کہ "اگر مسلک اعتزال باقی رہتا تو یہ جمود و تعطل جو آج مسلمانوں میں نظر آرہا ہے وجود میں نہ آتا اور علم و فکر کی دنیا میں مسلمان آج ایسے مقام پر کھڑے ہوتے جہاں ان کا کوئی مقابل نہ ہوتا۔" (طلوع اسلام صفحہ جولائی ۱۹۵۵ء)

رہنما، مفسر قرآن، شارع قانون، قاضی اور حاکم بھی مقرر کیا تھا۔ لہٰذا جو شخص آپ کی پیروی سے آزاد ہو کر قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ فی الحقیقت قرآن کا پیروکار نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کی قرآنی تاویلات بھی کھل کر لوگوں کے سامنے آچکی تھیں۔ جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور متضاد تھیں۔ لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر قرآن سے سنت کا تعلق ختم کر دیا جائے تو دین کا حلیہ کس بری طرح سے بگڑ جاتا ہے۔

۳۔ امت کا اجتماعی ضمیر یہ تصور بھی اپنے ذہن میں نہ لا سکتا تھا کہ مسلمان رسول ؐ کی پیروی سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ جو آج تک امتِ مسلمہ میں متوارث چلی آرہی تھی چند سر پھرے انسان تو ہر زمانہ اور ہر قوم میں ایسے نکل سکتے ہیں جو ایسی باتوں میں ہمنوا بن جائیں۔ لیکن پوری امت کا سر پھرا ہو جانا مشکل ہے چنانچہ امتِ مسلمہ اس بات پر قطعاً آمادہ نہ ہو سکی کہ زندگی کا ایک نیا نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے بنوایا جائے جو دنیا کے مادی فلسفہ اور تمدن سے مرعوب ہو کر اسلام کا ایک جدید ایڈیشن پیش کرنا چاہتے تھے۔

۴۔ اعتزال کی تحریک کو حکومت عباسیہ کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن امت کے اجتماعی تاثر سے خلیفہ واثق باللہ خود بھی متاثر ہو چکا تھا۔ رہی سہی کسر اس مناظرہ نے نکال دی جس نے اس کے ذہن کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ بعد میں جب خلیفہ متوکل علی اللہ نے اعتزال کی جانب سے اپنا منہ موڑ لیا تو یہ تحریک اپنی موت آپ مر گئی

نتائج

جہم و اعتزال کی تحریک کے مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل نتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں :

۱۔ جب کبھی اسلام میں نئے نظریات کو داخل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ بالعموم اس دور کے غالب رجحانات سے ذہنی شکست خوردگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خواہ یہ نظریات فلسفہ سے تعلق رکھتے ہوں یا سائنس سے۔

۲۔ ان نظریات کو تسلیم کروانے کے لیے عقل کی برتری اور تفوق کا ڈھنڈورا پیٹنا پڑتا ہے۔ عقل کی برتری و تفوق جہم و اعتزال دونوں کے عقیدہ کا اہم جزو تھا۔

۳۔ ان نظریات کی پہلی زد احادیث اور بالخصوص خبر واحد پر پڑتی ہے۔ جن میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کر کے انہیں ظنی اور ناقابل اعتماد قرار دیا جاتا ہے۔

کیونکہ یہی احادیث نئے نظریات کو اسلامی عقائد میں داخل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ امام ابن تیمیہ ان لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہ لوگ آنحضرت ؐ کی احادیث کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ احاد ہیں، اور ان سے علم حاصل نہیں ہوتا اور ذہنی خیالات اور باطل شبہات کو قبول کر لیتے ہیں، جو معتزلہ جہمیہ اور فلاسفہ سے منقول ہیں۔ اور ان کا نام براہین عقلیہ رکھ لیتے ہیں"۔ (صواعق۔ جلد ۲۔ ص ۲۷۵ بحوالہ جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۲۱۹) اس لیے معتزلہ قانون اسلامی کے ماخذ میں سے حدیث اور اجماع کو قریب قریب ساقط کر دیتے ہیں۔ (الفرق بین الفرق ص ۱۲۷ بحوالہ خلافت و ملوکیت ص ۲۱۹) پھر جہم و اعتزال چونکہ مسئلہ تقدیر میں متضاد خیالات رکھتے ہیں۔ لہٰذا جو احادیث جہم کے نزدیک مردود تھیں۔ وہی اعتزال کے نزدیک صحیح ترین تھیں۔ اسی طرح جو احادیث معتزلہ کے ہاں ناقابل قبول تھیں۔ وہی جہمیہ کے ہاں قابل قبول تھیں۔ اور دونوں عقلی دلائل سے ان احادیث کو رد و قبول کا شرف بخشتے تھے۔

۴۔ حدیث کی حجیت سے انکار کے بعد قرآن کی من مانی تاویلات کی گنجائش نکل آتی ہے۔ لیکن یہاں بھی متضاد نظریات کے باعث یہی صورت حال تھی۔

۵۔ حدیث کی حجیت سے انکار اور قرآن کی تاویل لازم و ملزوم ہوتی ہے۔ جو شخص حدیث سے انکار کرے گا۔ تو وہ لازمی طور پر قرآن کی کوئی نئی توجیہ بھی پیش کرے گا۔ جو اس کے خیالات و نظریات کی آئینہ دار ہو گی۔ نیز یہ توجیہ حقیقتاً قرآن کی تحریف ہو گی۔ لہٰذا حدیث کی حجیت سے انکار کے اصل محرک وہ عجمی تصورات و نظریات ہوتے ہیں۔ جنہیں کوئی مسلمان اسلامی نظریات سے زیادہ سائنٹیفک اور برتر سمجھتا ہے۔

باب (۳)

عجمی تصورات کا دوسرا دور

بیرونی فلسفوں اور غیر اسلامی نظریات کا دوسرا دور تیرھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ لیکن دوسری صدی ہجری کی بہ نسبت اب حالات بہت مختلف تھے اس وقت مسلمان فاتح تھے اور انہیں سیاسی غلبہ حاصل تھا۔ اور جن فلسفوں سے انہیں سابقہ پیش آیا تھا وہ مفتوح و مغلوب قوموں کا فلسفہ تھا۔ اس وجہ سے ان فلسفوں کا حملہ بہت ہلکا ثابت ہوا۔ اس کے برعکس تیرھویں صدی ہجری میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جبکہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکا تھا۔ اس کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ معاشی حیثیت سے انہیں کچل ڈالا گیا تھا۔ ان کا نظامِ تعلیم درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے قوانین اور اپنے اجتماعی، سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلط کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں فاتحوں کے فلسفے اور سائنس نے ان کو معتزلہ کی نسبت ہزار درجہ زیادہ مرعوب کر دیا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب سے جو افکار و نظریات درآمد ہو رہے ہیں۔ وہ سراسر معقول ہیں ان پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقید کر کے حق و باطل کا فیصلہ کرنا محض تاریک خیالی ہے۔ اور زمانہ کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہی ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال لیا جائے۔

اس شکست خوردہ ذہنیت نے وہی پہلی معتزلہ والی سہ گونہ ٹیکنیک استعمال کی یعنی:۔

(۱) احادیث کو جہاں تک ہو سکے مشکوک اور ظنی قرار دیا جائے۔ اور مفسرین پر الزام لگایا جائے کہ وہ اسرائیلی روایات سے استفادہ کرتے ہیں۔

(۲) سنت کے حجت یا سند ہونے سے انکار کر دیا جائے اور اس کے بعد

(۳) قرآن کی من مانی تاویلات کے لیے راستہ صاف کر لیا جائے۔

لیکن آج اس ٹیکنیک کو استعمال کرنے کی صورت وہ نہیں جو معتزلہ کے دور میں تھی۔ معتزلین خود ذی علم لوگ تھے۔ عربی زبان و ادب میں بڑا پایہ رکھتے تھے اور ان کو سابقہ بھی

ایسے لوگوں سے پڑا تھا جن کی علمی زبان عربی تھی۔ عام لوگوں کا تعلیمی معیار بلند تھا، علمائے دین ہر طرف بکثرت موجود تھے۔ لہٰذا معتزلین بہت سنبھل کر بات کرتے تھے۔ مگر آج کا دور ایسا ہے کہ معترضین کا علم دین کا سرمایہ بیشتر مستشرقین مغرب کا مرہون منت ہے۔ اور عوام کی علمی سطح انتہائی پست ہے۔ لہٰذا آج کا حملہ بھی معتزلین کے حملہ سے دوگونہ وجوہ کی بنا پر شدید تر ہے۔

سر سید احمد خاں

اس دور کے سرخیل سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) ہیں آپ نے مغرب میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مغربی افکار و نظریات سے شدید متاثر تھے۔ اور مسلمانوں کی بھلائی اسی بات میں سمجھتے تھے کہ وہ مغربی علوم سے آراستہ ہوں۔ اور اس تہذیب کو جوں کا توں اپنا لیں۔ اس غرض کے لیے آپ نے دوگونہ اقدامات کیے ایک تو ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ مسلم کالج کی داغ بیل ڈالی۔ دوسرے اسی دور میں قرآن کریم کی تفسیر لکھ کر اپنے نظریات کو کھل کر قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس دوگونہ اقدام سے آپ نے مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہن میں مغربی افکار و نظریات بھرنے اور مسلمات اسلامیہ کا حلیہ بگاڑنے کی جو خدمات انجام دیں اس پر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنچ گم ہر طرف ڈھونڈا ہی ڈھونڈا   وائے بر سعی سید احمد خاں !!

یہ وہ دور تھا جب یورپ صرف اس بات کو ماننے پر تیار رہتا تھا جو عقل و تجربہ کی کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہو۔ بالفاظ دیگر کوئی ایسی بات جو مافوق الفطرت (SUPPER NATURAL) یا خارق عادت ہو۔ اہل مغرب کے ہاں ناممکن الوقوع اور خلاف عقل سمجھ کر رد کر دی جاتی تھی۔

دوسرے سر چارلس ڈارون (۱۸۰۹ - ۱۸۸۲ء) کا نظریۂ ارتقاء بھی منظر عام پر آ چکا تھا۔ یہ سوال ڈارون سے پہلے بھی پیدا ہو چکا تھا کہ آیا انسان اولاد ارتقاء ہے۔ یا اس کی پیدائش کسی دوسری نوعیت سے ہوئی تھی۔ ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں ایک کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPICIES) لکھ کر یہ نظریہ مدوّن طور پر پیش کیا۔ کہ انسان اولاد ارتقاء ہے۔

تیسرے یہ دور خالص مادیت پرستی کا دور تھا۔ ہر کام کے زیبا و نازیبا ہونے کا معیار دنیوی نفع و نقصان بن گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس تہذیب نو نے مساوات مرد و زن کا نعرہ لگا کر کئی قسم کے عائلی مسائل کھڑے کر دیے تھے، جو اسلامی تعلیمات سے براہ راست ٹکراتے تھے۔

چونکہ سرسید ان تمام افکار و نظریات سے شدید متاثر تھے۔ لہذا آپ نے:۔

(۱) انبیاء کے معجزات سے یا تو سرے سے انکار ہی کر دیا یا ایسی تاویل پیش کی کہ وہ معجزہ ہی نہ رہتے۔ خواہ یہ تاویل بجائے خود کتنی ہی غلط اور مضحکہ خیز کیوں نہ ہو۔

(۲) معجزات کے علاوہ باقی خوارقِ عادت باتیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ان میں بھی ایسی ہی تاویلات پیش کیں۔ مثلاً دُعا کی قبولیت یا جنت دوزخ کی بعض کیفیات۔

(۳) ڈارونی نظریۂ ارتقاء سے متاثر ہو کر حضرت آدم کے فردِ واحد یا نبی ہونے سے انکار کر دیا۔ نیز فرشتوں اور ابلیس کے خارجی تشخص سے بھی جس سے ایمان بالغیب کے بہت سے اجزاء پر زد پڑتی ہے۔

(۴) مسائل حاضرہ پر قلم اٹھا کر موجودہ تہذیب سے ہم آہنگی میں اسلامی عقائد و نظریات کا حلیہ بگاڑ دیا۔

ہم یہاں انہی باتوں کو زیر بحث لائیں گے۔ آپ نے چند در چند رسائل لکھ کر اپنے مخصوص نظریات امت کے سامنے پیش کیے۔ اس "ماڈرن اسلام" کی غرض وغایت کا اندازہ آپ کی ایک تقریر کے درج ذیل اقتباسات سے ہوتا ہے۔

جدید علم کلام کی ضرورت اور خصوصیات "اس زمانہ میں ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کو باطل ثابت کر دیں یا پھر انہیں اسلام کے مطابق کر دکھائیں میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا ان کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے۔ وہ سب گنہگار اور یقیناً گنہ گار رہوں گے۔" (پاکستان کا معمار اول سرسید ص۵ مطبوعہ طلوع اسلام لاہور)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ سید صاحب کے خیال میں:۔

(۱) موجودہ علوم طبیعی اور فلسفہ کا یا تو بطلان ثابت کرنا یا پھر انھیں اسلام کے مطابق کر دکھانا ایک بہت بڑا دینی فریضہ ہے۔

(۲) جو لوگ اہلیت ہونے کے باوجود ان دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کرتے وہ گنہ گار ہیں۔

اور سید صاحب نے اس گناہ سے بچنے اور دینی فریضہ کو انجام دینے کے لیے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ علم طبیعی یا فلسفہ کو باطل تو ثابت نہ کر سکے۔ البتہ بزعم خود انہیں اسلام کے مطابق کر دکھایا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ علم طبیعی اور فلسفہ کو اسلام کے

مطابق ثابت کرنے کی بجائے اپنی تمام تر کوششیں اور اہلیتیں اُلٹا اسلام کو علم طبیعی و فلسفہ کے مطابق کرنے میں صرف کردیں۔ اس اہم کام کے لیے جو طریق کار انہوں نے اختیار کیا وہ بھی درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

حدیث اور فقہ سب ناقابلِ حجت ہیں "اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان مُلہم من اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخرالزمان کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے اور جس میں جو بات مسائل فلسفہ اور حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔ پس انہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے "حَسْبُنَا کِتَابُ اللہِ"[۱] کہہ کر اپنے جدید علم کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآن مجید کو قرار دیا اور اس کے سوا تمام مجموعہ حدیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جواب دہ خود علماء و مفسرین اور فقہاء و مجتہدین میں نہ کہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کردیا۔ اسی اصول کو ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔" (حیاتِ جاوید بحوالہ پاکستان کا معمار اوّل ص۵۷)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مجوزہ "کارِ عظیم" کے راستے میں تمام مجموعۂ احادیث، تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات ہی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ لہٰذا آپ نے ان تمام چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور ان سب سے بے نیاز ہو کر قرآن کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ قرآن کے متعلق آپ کا نظریہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:۔

قرآن اور نیچر "ضروری تھا کہ قرآن مجید کی ہدایتیں اس طرح بیان کی جائیں کہ اس سے ایک صحرائی اونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سُقراط برابر فائدہ اٹھائیں۔ غرض قرآن مجید ہی ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس کے مختلف وجوہ بلکہ متضاد

[۱] حسبنا کتاب اللہ پر تفصیلی بحث اگلے مضمون کی صورت میں آگے آرہی ہے۔

حیثیتوں کے لوگوں کی یکساں ہدایت ہوتی ہے کیک جاہل بدّو ایک مقدس مولوی اس کے معانی سے جیسے ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفہ کے خلاف نہیں پاتا۔" (حیاتِ جاوید بحوالہ پاکستان کا معمار اول ص ۵۸)

اس اصول سے کسی کو بھی اختلاف کی گنجائش نہیں لیکن ہدایت حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم نے خود ہی ایک اور شرط بھی عائد کی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ :

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲/۲۶)

خدا اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے اور وہ گمراہ بھی کرتا ہے۔ تو نافرمانوں ہی کو۔

یعنی قرآن واقعی سب کے لیے ہدایت ہے۔ مگر جو قلب سلیم کے ساتھ اس سے ہدایت حاصل کرنا چاہے اور جس کا دل کجرو اور فاسق نہ ہو۔ جو قرآن کی روشنی کے تابع ہو کر چلنا چاہے نہ کہ قرآن کو اپنے قلب و ذہن کے تابع کرنا چاہے۔ سارے بدّو یا مولوی یا ہر زمانہ کے سقراط اس سے ہدایت ہی نہیں پاتے۔ بیشتر گمراہ بھی ہو جاتے ہیں اور مشاہدہ بھی اس بات کی تائید و توثیق کرتا ہے۔ کہ اکثر گمراہ فرقوں اور مذاہبِ باطلہ کے بانی انتہا درجہ کے ذہین و فطین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے کہ قرآن ہر فلاسفر کے فلسفہ یا ہر نیچری کی نیچریت کے مطابق ہے۔ یہ تو مسلّم امر ہے کہ نیچر یا تمام قوانین فطرت کا احاطہ کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ تو جن چند قوانین فطرت پر انسان کو آگہی حاصل ہوئی ہے انہیں تک قرآن کو محصور کر کے قرآنی آیات کی ان کے مطابق تاویل کر دینا کونسی دینی خدمت ہے؟ فلسفہ کا معاملہ اس سے بھی نازک ہے۔ فلسفہ ایک استدلالی علم ہے مگر انسان کی زندگی فلسفہ یا استدلالی علم کی پابند نہیں۔ زندگی میں بہت سی باتیں وجدان سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور قرآن کتابِ زندگی ہے۔ فلسفہ کی کتاب نہیں۔ لہٰذا جو شخص فلسفہ یا نیچر یا کسی خاص دور کی علمی سطح سے مرعوب ہو کر قرآن سے اس کا بطلان[1] ثابت کرنے کی بجائے قرآن کو ان چیزوں کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اس کی ذہنی شکست خوردگی کی دلیل تو بن سکتی ہے قرآن کی تفسیر نہیں کہلا سکتی۔ سید صاحب اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہوں نے قرآن کو نیچر اور فلسفہ کے ماتحت بنا دیا ہے۔

---

[1] بلاشبہ اسلامی تاریخ میں ایسے بہت سے فلاسفر ہوئے ہیں کہ جنہوں نے قرآن کے ساتھ احادیث سے اقوال مفسرین کے اقوال و آثار سے فقہا و مجتہدین کے قیاسات اور اجتہادات سے بھرپور استفادہ بھی کیا اور اپنے دور کے فلسفہ کا بطلان بھی کیا جیسے امام احمد بن حنبل، امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ وغیرہم۔

اب ہم سرسید کی تفسیر "تفسیر القرآن" سے آپ کے چند کارہائے نمایاں مختصراً بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کے نظریات

معجزات سے انکار

معجزہ کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے۔ کوئی ایسا خرقِ عادت یا عام دستور اور مشاہدہ کے خلاف واقعہ جس کا صدور کسی نبی سے ہوا ہو۔ قرآن نے معجزہ کے لیے آیت یا بصیرۃ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور ایسا کوئی نہ کوئی معجزہ انبیاء کے ساتھ لازم ملزوم سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس لیئے انبیاء کے مخاطبین بالعموم ان سے اپنی بات کی صداقت کے ثبوت میں معجزہ کا مطالبہ بھی کرتے رہے ہیں۔ ایسے خرقِ عادت واقعات کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) انسان کی عادت ہے کہ کوئی واقعہ عادت کے خلاف سنتا ہے تو بالعموم اس کا انکار کر دیتا ہے اور اگر بچشم خود دیکھ لے تو حیران رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہی واقعہ دو تین چار مرتبہ پیش آ جائے۔ تو وہ عادت بن جاتا ہے لہٰذا اس کی حیرانگی اور استعجاب ختم ہو جاتا ہے اس کی سب سے واضح مثال نو انسان کی اپنی پیدائش ہے۔ جو ناپاک پانی کے قطرہ سے پیدا ہوتا ہے اور جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ لیکن چونکہ یہ عادت مستمرہ بن چکی ہے۔ لہٰذا اس پر کسی طرح کی حیرت و استعجاب تو درکنار خیال تک بھی انسان کے دل میں نہیں آتا۔

اس کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی ایک واقعہ انسانی تاریخ کے کسی مخصوص دور میں تو معجزہ سمجھا جاتا ہے لیکن بعد کے ادوار میں وہ معجزہ نہیں رہتا۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا کیا گیا تھا کہ ہوا ان کے تابع تھی اور وہ ایک ماہ کا سفر ایک پہر میں طے کر لیتے تھے۔ لیکن آج ہوائی جہاز کی دریافت نے اس معجزہ کی اعجازی حیثیت کو ختم کر دیا ہے، یا اسیطرح اگر ارسطو یا فیثاغورث کے زمانہ میں کوئی شخص یہ اعجاز پیش کرتا کہ یونان میں بیٹھ کر پاکستان میں رہنے والے کسی شخص سے بات چیت کر رہا ہے تو اسے عوام تو درکنار مفکرین بھی پاگل ہی قرار دیتے۔ لیکن آج ٹیلیفون کی ایجاد نے اس کی اعجازی حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اشیائے کائنات کے خواص سے متعلق انسان

کا علم یا لاعلمی ہی کسی ایک واقعہ کو کسی خاص دَور میں تو معجزہ سمجھتی ہے لیکن وہی واقعہ اس سے اگلے دور میں عادت بن جاتا ہے۔ اب دیکھئے قرآن کریم میں ایسے بے شمار واقعات مذکور ہیں۔ جو آج تک معجزہ ہی بنے ہوئے ہیں۔ اور انسان کا علم اس گتھی کو سلجھا نہیں سکا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے معجزات کو من وعن قبول کر لینا چاہئیے یا ان کی تاویل پیش کر کے انسان کی علمی سطح تک نیچے لانا چاہیئے؟ یہ سوال درحقیقت یہ سوال ہے کہ آیا کہ انسان اشیائے فطرت کے خواص اور قوانین کا پورا احاطہ کر چکا ہے؟ اگر تو اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو ایسے معجزات کا من وعن تسلیم کرنا ہی راہِ صواب ہے۔ اس سوال کے جواب میں سید صاحب خود لکھتے ہیں :-

سرسیّد کا نظریہ معجزات

"تمام قوانین قدرت ہم کو معلوم نہیں اور جو معلوم ہیں، وہ نہایت قلیل ہیں اور ان کا علم بھی پورا نہیں بلکہ ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی عجیب امر واقع ہو اور اس کے وقوع کا کافی ثبوت بھی موجود ہو اور اس کا وقوع معلومہ قانون قدرت کے مطابق بھی نہ ہو سکتا ہو۔ اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بغیر دھوکہ وفریب کے فی الواقعہ ہوا ہے۔ تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فی الواقعہ بلاشبہ اس کے وقوع کے لیے کوئی قانونِ قدرت ہے مگر اس کا علم ہم کو نہیں کہ خلافِ قانونِ قدرت کوئی امر نہیں ہوتا۔ اور جب وہ کسی قانونِ قدرت کے مطابق واقع ہوا ہے تو وہ معجزہ نہیں کیونکہ ہر وہ شخص جس کو وہ قانون معلوم ہو جائے اس کو کر سکے گا" (تفسیر القرآن ج ۲ ص۳۴) ...... "حکماء و فلاسفہ نے معجزات یا کرامات کا انکار خواہ کسی وجہ سے کیا ہو ہمارا انکار صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ مخالف عقل کے ہیں۔ اور اس لیے انکار کرنا ضرور ہے۔ بلکہ ہمارا انکار اس بنا پر ہے کہ قرآن مجید سے معجزات وکرامات یعنی ظہور امور کا بطور خرق عادت یعنی خلافِ فطرت یا خلافِ جبلّت کے امتناع پایا جاتا ہے۔ جس کو ہم مختصر لفظوں میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی امر خلاف قانون قدرت نہیں ہوتا" (ایضاً ص۳۷)

غور فرمایا آپ نے سید صاحب کے معجزہ کے اقرار میں بھی کتنے انکار پوشیدہ ہیں۔ آپ معجزہ سے صرف اس لیے انکار کر رہے ہیں کہ قرآن کریم میں کسی خلاف قانونِ قدرت واقعہ کا ذکر نہیں۔ یہاں دو سوال ذہن میں ابھرتے ہیں :-

(۱) کیا قانونِ قدرت کے خلاف کسی امر کا وقوع ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اور

(۲) کیا قرآن کریم میں ایسے کسی واقعہ کا ذکر ہے بھی یا نہیں جو قانونِ قدرت کے خلاف ہو؟

اب ہم انہی سوالات پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

قوانین قدرت میں تبدیلی

قوانینِ قدرت کے غیر متبدل ہونے کے ثبوت میں جو آیت پیش کی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے:

وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۝ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا (۳۵/۴۳)

سو تم خدا کی عادت میں ہرگز تبدل نہ پاؤ گے اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔

اب سوال یہ ہے قوانینِ قدرت تو لاتعداد ہیں۔ کچھ قوانین اجرام فلکی کی حرکت، ان کی کشش ثقل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ دوسرے اشیاء کے خواص سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً پانی ہمیشہ نشیب کی طرف ہی بہتا ہے۔ مائعات جم کر سکڑ جاتے ہیں۔ ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھتی ہے۔ زہر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ پھر کچھ قوانین ایسے ہیں جو اخلاقیات اور قوموں کے عروج وزوال سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر کچھ قوانین ایسے ہیں جو جاندار اشیاء کے طبعی تقاضوں اور حیات وممات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ قرآن کریم جس "اللہ کے طریقہ" یا قانونِ قدرت کو غیر متبدل قرار دیتا ہے وہ کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآن میں یہ الفاظ متعدد بار استعمال ہوئے ہیں۔ اور ان سب مقامات کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قانون کو غیر متبدل قرار دیا ہے۔ وہ انسان کی اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے اور قوموں کے عروج وزوال کے قانون کو غیر متبدل قرار دیتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم اپنی سرکشی کی بنا پر نبی کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیتی ہے یا نبی بحکمِ الٰہی وہاں سے نکل جاتا ہے۔ یا کوئی قوم اخلاقی پستیوں میں گر جاتی ہے۔ تو وہ عذاب میں ماخوذ اور زوال پذیر ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا قانون ایسا قانون ہے۔ جس میں تغیر وتبدل ناممکن ہے۔ اب آیاتِ ذیل ملاحظہ فرمایئے

(۱) وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا (۳۵/۴۳)

اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے ہی پر پڑتا ہے۔ یہ لوگ تو بس پہلے لوگوں کی روش کے ہی منتظر ہیں سو تم خدا کی عادت میں ہرگز تبدل نہ پاؤ گے اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔

(۲) وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۝ (۱۷/۷۷)

اور قریب تھا کہ یہ لوگ تمہیں زمین (مکہ) سے پھسلا دیں تاکہ تمہیں وہاں سے جلا وطن کر دیں اور اس وقت تمہارے بعد یہ بھی نہ رہتے مگر تھوڑی مدت۔ جو پیغمبر ہم نے تجھ سے پہلے بھیجے تھے ان کے بارے میں ہمارا طریق یہی رہا ہے اور تم ہمارے طریق میں تغیر وتبدل نہ پاؤ گے۔

(۳) مَلْعُونِينَ ۚ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝ (۶۰-۶۱-۶۲/۳۳)

دھتکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور جان سے مار ڈالے گئے جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی ہماری یہی عادت رہی ہے اور تم خدا کی عادت میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔

(۴) ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝ (۲۲-۲۳/۴۸)

پھر کسی کو دوست نہ پاتے اور نہ مددگار یہی خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

قوانینِ قدرت اور استثنائی صورتیں

مندرجہ بالا جملہ مقامات میں قوموں کی اخلاقیات اور اُن کے زوال کا قانون بیان کیا گیا ہے اور یہی ایسا قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ رہے دوسرے قوانینِ فطرت یا قدرت تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ان میں تبدیلی ممکن ہے۔ مثلاً :-

(۱) اجرامِ فلکی کی حرکت کے قوانین جو ہمیں لگے بندھے اصُولوں کے مطابق نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں بنی نوع انسان کی عمر نہایت قلیل ہے ورنہ اس عظیم کائنات کا وجود میں آنا اور پھر کسی وقت فنا ہو جانا ان قوانین میں تغیر و تبدّل کی واضح دلیل ہے۔

(۲) زہر کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کے لیے ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن کبھی وہی زہر کسی انسان کے لیے تریاق بھی بن جاتا ہے اس کی وجہ خواہ کچھ ہو لیکن واقعہ سے انکار ممکن نہیں۔

(۳) دوسری تمام مائعات کے برعکس پانی جم کر پھیل جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے مائعات جم کر سکڑتے ہیں۔ یہ ایسی استثنائی صورت ہے۔ جو انسان کے علم میں آچکی ہے۔ مگر عام قانونِ فطرت سے اس استثناء میں کسی کو مجالِ انکار نہیں۔

(۴) کسی مخصوص مقام پر بارش کے طبعی عوامل یہ ہیں۔ سمندر سے فاصلہ، موسم، ہوا اور اس کا رخ، پہاڑوں کی بلندی، پھر کیا وجہ ہے کہ کسی مخصوص مقام پر خاص موسم میں کبھی تو وہ موسم بالکل خشک گزر جاتا ہے اور کبھی لگاتار بارشوں سے سیلاب آجاتے ہیں۔ اور کبھی معمول کے مطابق بارش ہوتی ہے۔ تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے۔ کہ کوئی بالاتر ہستی موجود ہے۔ جو ان قوانین قدرت کے تغیر و تبدل پر پورا کنٹرول رکھتی ہے۔ یہ اور ایسے بے شمار واقعات اور مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت

ہو جاتا ہے کہ قوانینِ قدرت میں مستثنیات موجود ہیں۔ اگر زہر کسی خاص انسان کے لیے تریاق بن سکتا ہے تو آگ بھی کسی خاص انسان کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوسکتی ہے

معجزات سے انکار کی اصل وجہ ہمارے خیال میں انکارِ معجزات کی وجہ یہ نہیں کہ قوانین فطرت میں استثنا ناممکن ہے۔ کیونکہ ایسے مستثنیات تو مشاہدہ میں آتے ہی رہتے ہیں۔ کسی انسان کے ہاں دو سر والا بچہ بھی پیدا ہو سکتا ہے ماں باپ دونوں اندھے ہوں تو اولاد بینا بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس انکار کی تہہ میں وہی ارسطو کا خدا کے متعلق تجریدی تصور کارفرما ہے جس کے تحت خدا نے ایک دفعہ کائنات کو حرکت تو دے دی ہے اور اب وہ خاموش تماشائی بن گیا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس نے قوانینِ فطرت بنا دیئے ہیں۔ اور اب خود بھی ان کا پابند بن گیا ہے۔ لیکن قرآن ایسے خدا کا تصور پیش کرتا ہے جو حیّ و قیوم قادرِ مطلق اور حکیم و خبیر ہے اور جیسے چاہتا ہے جب چاہتا ہے۔ کر سکتا ہے۔ وہ قوانینِ فطرت کا پابند نہیں۔ قوانینِ فطرت اس کے حکم کے پابند ہیں۔ وہ ان قوانین میں ہر وقت اپنی حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر تغیر و تبدل کر سکتا اور کرتا رہتا ہے۔

قرآن کریم میں مذکور معجزات

خدا کو "قدرت و اختیار" کی کرسی سے ہٹا کر جب آپ نے قرآن میں ایسے بے شمار معجزات کا ذکر دیکھا۔ تو انہوں نے ان معنوں میں معجزات کا یکسر انکار کر دیا جو معنے قرآن کریم کی عبارت و الفاظ سے واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ بلکہ ان واقعات کا رخ اس طرح موڑا اور قرآنی الفاظ کی ایسی مضحکہ خیز تاویل پیش فرمائی۔ کہ ان تمام معجزات کو "مطابقِ فطرت" بنا کے چھوڑا۔ اور اس کارِ خیر میں اتنی کوشش فرمائی کہ اب انہیں قرآن کریم میں کوئی معجزہ نظر ہی نہیں آتا۔

ہم یہاں آپ کی تمام تر تاویلات کا ذکر نہیں کر سکتے۔ البتہ از راہِ تفنن چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ آگ کا ٹھنڈا ہونا حضرت ابراہیمؑ کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ انہیں سرے سے آگ میں ڈالا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ معاملہ محض کفّار کی کوششوں اور تدبیروں تک ہی محدود رہا۔ (تفسیر القرآن دیباچہ ص۱۷) آپ کی دلیل یہ ہے کہ :۔

﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا﴾ ہم نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیم کے حق میں ٹھنڈی

عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ ۝ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ (۲۱: ۶۹-۷۰) اور سلامتی والی ہو جا۔ ان لوگوں نے حضرت ابراہیم کے لیے تدبیر کی، سو ہم نے انہیں ناکام بنا دیا۔

.... " اب ان کی تدبیر کیا تھی؟ وہ تدبیر یہ تھی کہ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا جائے اور وہ اللہ نے ناکام بنا دی۔" اب سوال یہ ہے کہ اگر اتنی ہی بات تھی تو اللہ تعالیٰ کا آگ کو ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جانے کا حکم دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے اتنا بھی علم نہ تھا کہ ہونا ہوانا تو کچھ ہے نہیں پھر آگ کو ایسا حکم دینے کا کیا مطلب؟

۲۔ اصحابِ فیل اصحابِ فیل کا قصہ قرآن میں یوں مذکور ہے۔ کہ ابرہہ حاکم یمن کے ہاتھیوں کے لشکر پر اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جھنڈ بھیجے۔ جنہوں نے اس لشکر پر اتنی کنکریاں برسائیں کہ سارے لشکر اور ہاتھیوں کو چھلنی کر کے کھائے ہوئے بھُس کی طرح بنا دیا۔ اب سید صاحب اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور وہ فوج مر گئی۔"

اب سوال یہ ہے کہ اس وبا کی مکہ والوں سے کیا دوستی تھی کہ اس نے انہیں تو کچھ نہ کہا اور ابرہہ کے لشکر کو ہاتھیوں سمیت ختم کر کے دم لیا۔ حالانکہ یہ دونوں ایک ہی علاقے اور ایک ہی وقت میں موجود تھے؟ پھر بیہ ہاتھیوں کی چیچک کا تصور بھی خوب ہے۔

اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کی آیت:

تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ (۱۰۵/۴) جو ان پر پتھروں کی کنکریاں پھینکتے تھے۔ سے چیچک کی وبا کا تصور کیسے کشید کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ عصائے موسیٰ اور ید بیضا اب ملاحظہ فرمائیے ان تاویلات کی زد کہاں تک پہنچتی ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں:۔

" ان آیتوں پر جو عصائے موسیٰ کے سانپ بننے اور ید بیضا پر دلالت کرتی ہیں، غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو حضرت موسیٰ پر طاری ہوئی اسی قوتِ نفسِ انسانی کا ظہور تھا جس کا اثر خود ان پر ہوا تھا۔ یہ کوئی معجزہ یا فوق الفطرت نہ تھا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزہ کے دکھانے کا موقعہ تھا اور نہ یہ تصور ہو سکتا ہے۔ کہ وہ پہاڑ کی تلی کوئی مکتب تھا جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو۔ حضرت موسیٰ بھی از روئے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینک دی

اور وہ ان کو سانپ یا اژدھا دکھائی دی۔ یہ خود ان کا تصرف اپنے خیال میں تھا۔ وہ لکڑی لکڑی ہی تھی۔ اس میں فی الواقعہ کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ خدا نے اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ فَانْقَلَبَتِ الْعَصَا ثُعْبَانًا (یعنی وہ لاٹھی بدل کر سانپ ہو گئی) بلکہ سورہ نحل میں فرمایا کَاَنَّھَا جَآنٌّ یعنی وہ گویا اژدہا تھا اس سے ظاہر ہے کہ وہ درحقیقت اژدہا نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ وہ لاٹھی کی لاٹھی ہی تھی" (تفسیر القرآن ج ۳ ص ۲۲۲)

سید صاحب کی اس تحقیق پر دو اعتراضات وارد ہوتے ہیں:۔

(۱) ہمیں قوتِ باطنی بھی تسلیم ہے۔ قوتِ نفسانی یا قوتِ مقناطیسی جو کچھ آپ کہیں تسلیم ہے اور یہ بھی تسلیم ہے کہ اس قوت کو حاصل کرنے والے عامل دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن ان کا خود اپنے ہی عمل سے متاثر ہونا یہ ناممکن الوقوع بات ہے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا عامل بھی دیکھا ہے کہ دوسرے پر اپنا اثر یا توجہ ڈالے مگر اس چیز پر تو کچھ اثر نہ ہو۔ اُلٹا عامل پر ہی اثر پڑنا شروع ہو جائے۔ کیا عامل اس لیے عمل کرتے ہیں کہ ان کے اپنے ہی اوسان خطا ہو جائیں؟ گویا حضرت موسیٰ کی اس قوتِ مقناطیسی سے عصا کی لکڑی پر تو خاک اثر نہ ہوا۔ اُلٹی انہیں ہی وہ اژدہا نظر آنے لگی۔ پھر وہ اس سے اس قدر دہشت زدہ بھی ہوئے کہ پیچھے ہٹنے لگے۔ کیا کوئی ایسا عمل بھی کرتا ہے جس کا فائدہ تو کچھ نہ ہو الٹا عامل کو نقصان پہنچ جائے۔

(۲) آپ نوعِ انسان میں توارتقاء کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں لیکن کسب کمال یا فن کے سلسلہ میں یہ اصول قطعاً نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں۔ کہ موسیٰ کی قوت مقناطیسی اثر جو کچھ بھی تھا۔ خواہ وہ حقیقتاً اژدہا بن گیا تھا یا بقول آپ کے وہ لکڑی کی لکڑی رہا۔ لیکن آپ نے اسے اژدہا ہی سمجھ لیا اور پھر وہ ڈر بھی گئے۔ یہ زندگی بھر کا پہلا مقناطیسی اثر یک لخت کیسے ظہور پذیر ہو گیا؟ یہ مقناطیسی قوت ابتدائے پیدائش سے ہی آپ میں موجود تھی یا وحی کے ساتھ پیدا ہوئی؟ اگر پہلے سے موجود تھی تو پہلے بھی کوئی چھوٹا موٹا واقعہ ضرور دریافت ہونا چاہیئے۔

یہ تو عقلی اعتراضات تھے۔ اب نقلی اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عصائے موسیٰ کے متعلق موسیٰ سے یوں فرماتے ہیں:۔

فَاَلْقٰھَا فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسْعٰی۝ قَالَ خُذْھَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُھَا سِیْرَتَھَا الْاُوْلٰی (۲۰: ۲۰-۲۱)	موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ ناگہاں سانپ بن کر دوڑنے لگا۔ خدا نے فرمایا کہ اسے پکڑ لو اور ڈرو مت ہم اس کو اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

اگر لکڑی لکڑی ہی رہی تھی۔ تو اس کو پہلی حالت پر لانے کا کیا مطلب ؟ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے کہ ہم تمہاری مقناطیسی قوت کم کر دیں گے، یا چھین لیں گے تا کہ تمہیں یہ لکڑی کی لکڑی ہی نظر آئے۔ سیرت تو بقول سید صاحب موسیٰؑ کی بدلنی چاہیے تھی نہ کہ عصا کی۔

سید صاحب اسی قوت نفسانی کے اثر سے ید بیضا کا مسئلہ بھی حل فرما دیتے ہیں۔ یعنی وہ بھی بس دیکھنے والوں کو چٹا نظر آتا ہے۔ کوئی معجزہ یا فوق الفطرت بات نہ تھی بعد میں آپ کو خیال آیا کہ:

"اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عصائے موسیٰ کا اژدہا بننا اور ہاتھ کا چٹا ہو جانا بھی اسی طرح قوتِ نفسانی کا اثر تھا جس طرح کہ فرعون کے جادوگروں کی رسیاں بھی سانپ دکھائی دیتی تھیں تو خدا نے عصائے موسیٰ اور ید بیضا کو فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ یعنی ان کو خدا کی طرف سے "برہان" کیوں فرمایا ہے؟ پھر اس کی وجہ یہ بتلائی کہ برہان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عصائے موسیٰ کا اژدہا مرئی ہونا یا ہاتھ کا چٹا دکھائی دینا۔ فرعون اور اس کے سرداروں پر بطور حجتِ الزامی کے تھا۔ وہ اس قسم کے امور کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے کہ جس شخص سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں وہ کامل ہوتا ہے اور اسی سبب سے انہوں نے کہا کہ اگر کوئی کرشمہ دکھایا جائے گا تو وہ دعویٰ کو سچا جانیں گے۔" (ج ۳ ص ۲۲۵)

اب سید صاحب کھل کر سامنے آ گئے۔ ان کے خیال کے مطابق عصائے موسیٰ اور ید بیضا معجزے نہیں بلکہ کرشمے تھے۔ جو فرعون کے جادوگروں کے کرشموں سے بڑے تھے۔ اسی لیے خدا نے ان کو برہان کہا ہے۔ تو اس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ موسیٰؑ سحرۃ فرعون سے بڑے ساحر ہوئے (نعوذ باللہ من ذٰلک) صرف درجہ کا فرق تھا۔ اور یہی فرعون کا گمان تھا: اس نے بھی یہی کچھ کہا تھا کہ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (۲۰/۷۱) جس کی سید صاحب نے تصدیق فرما دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے اس قول کو وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى (۲۰/۶۹) کہہ کر مردود قرار دیا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ۔

۴۔ دریا کا پھٹنا | یہ واقعہ بھی قرآن میں کئی مقامات پر بصراحت موجود ہے۔ ک
جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات نکلے اور فرعون ان کے

تعاقب میں نکلا تو حضرت موسیٰؑ نے بحکم الٰہی دریا پر اپنا عصا مارا۔ وہ پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، درمیان میں خشک راستہ پیدا ہو گیا۔ دریا کے دونوں حصے بڑے پہاڑ کی مانند کھڑے ہو گئے۔ موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے تو دریا عبور کر لیا۔ اور جب فرعون اور اس کے لشکری داخل ہوئے تو دریا جاری ہو گیا جس کی وجہ سے فرعون اور اس کے ساتھی غرق ہو گئے۔

اب سید صاحب کے ارشادات سنیئے۔

"نہ کوئی دریا پھٹا اور نہ کوئی خلافِ عادت معجزہ ظہور میں آیا تھا بلکہ اس دریا کی سمندر کی طرح عادت تھی کہ مدوجزر (چڑھنا اترنا) تانا نا اس میں ہوا کرتا تھا۔ پس جب رات کو موسیٰ بنی اسرائیل کے سمیت گزرے تھے اس وقت خشک تھا اور جب فرعون گزرنے لگا تو اتفاقاً چڑھ گیا۔" (تفسیر القرآن ج ۱ ص ۹۹)

اب دیکھئے کہ مادہ پرست تو ساری کائنات کو "اتفاقاً" ہی سے پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر سید صاحب نے دریا کے پانی کو اتفاقاً چڑھا دیا تو کونسی آفت آ گئی۔ لیکن یہ حیرانگی ضرور ہے کہ مدوجزر کے اوقات مقرر و متعین ہوتے ہیں۔ جو سب لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ فرعون اور اس کے لشکری بڑے ہی جاہل تھے کہ ان کی قلمرو میں ایک دریا بہہ رہا ہے اور وہ اس کے مدوجزر کے اوقات سے بھی ناواقف تھے جس کا علم بعد میں سید صاحب کو ہوا۔

اللہ تعالےٰ تو اس دریا کو پھاڑنے اور موسیٰ اور بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دینے کو ایک احسانِ عظیم کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔ اور سید صاحب ہیں کہ وہ اسے کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے اور اسے ایک فطری امر قرار دے رہے ہیں پھر احسانِ عظیم آخر کس بات کا تھا؟

۵۔ بارہ چشموں کا پھوٹنا اسی طرح موسیٰؑ کا ایک معجزہ یہ بھی تھا۔ کہ بنی اسرائیل کو پانی کی ضرورت تھی۔ موسیٰؑ نے پانی کے لیے دعا کی تو اللہ تعالےٰ نے موسیٰؑ سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اس کی تاویل آپ نے یہ فرمائی کہ:۔

حجر کے معنی پہاڑ کے ہیں اور ضرب کے معنی رفتن کے، پس صاف معنی یہ ہوئے کہ اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چل۔ اس پہاڑ کے پرے ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے، خدا نے فرمایا فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا یعنی اس میں سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔" (ایضاً ج ۱ ص ۱۱۳)

یعنی اگر حضرت موسیٰؑ لاٹھی کے سہارے نہ جاتے، لاٹھی کے بغیر وہاں جاتے تو شاید وہاں یہ بارہ چشمے موجود نہ ہوتے۔ یہ لاٹھی کے سہارے چلنے ہی کی برکت تھی، کہ وہاں بارہ چشمے موجود تھے اور یہ بھی شاید لاٹھی ہی کی کرامت تھی کہ وہ پورے بارہ ہی تھے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی بارہ ہی تھے۔

پہاڑ کے لیے عربی میں بہت سے الفاظ ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں مثلاً جبل، جبال، رَوَاسِیَ، طَود، صخرہ وغیرہ جو علی الترتیب چھوٹے بڑے پہاڑوں پر بولے جاتے ہیں۔ مگر حجر کے معنی پتھر ہی ہیں۔ پھر ضرب کا صلہ اگر فی ہو تو اس کے معنی چلنا ہوتے ہیں۔ جیسے ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ کے معنی زمین میں چلنا یا سفر کرنا ہے اور جب ضرب کا صلہ ب سے ہو تو اس کے معنی چلنا نہیں بلکہ کسی چیز سے مارنا ہوتے ہیں اور ب کے بعد اس آلہ کا ذکر ہوتا ہے جس سے مارا جائے۔ گویا اِضْرِبْ بِعَصَاكَ کے معنی لاٹھی سے مارنا ہی ہوں گے لاٹھی کے سہارے چلنا لغت کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔

۶۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور وفات

عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و ممات دونوں بڑے عظیم معجزے ہیں۔ حیات عیسیٰ یا حضرت عیسیٰ کا باپ ثابت کرنے میں تو سید صاحب اکیلے ہیں۔ مگر وفات عیسیٰ میں مرزا غلام احمد قادیانی (م ۔ ۱۹۰۸) بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ یہ الگ بات ہے تو مقاصد دونوں کے الگ الگ ہیں۔

مرزا صاحب کو مسیح موعود کی خالی کرسی درکار تھی۔ وہ جب تک ان کو فوت شدہ ثابت نہ کرتے یہ نہیں مل سکتی تھی اور سید صاحب کا مقصد مسلمانوں کو نیچر پسند ثابت کر کے مغرب سے سرخروئی حاصل کرنا اور مسلمانوں کو خرقِ عادت واقعات کو قبول کرنے کے بدنما داغ سے بچانا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان دونوں حضرات کے بنیادی نظریات میں براہِ راست تصادم ہے ایک صاحب پکے فطرت پرست ہیں تو دوسرے کی زندگی کا مدار ہی کرامات والہامات پر ہے۔ تاہم وفات مسیح کے مسئلہ پر دونوں کا اتحاد ہو جاتا ہے۔ دونوں حضرات تاویلات میں خوب ماہر ہیں اور مرزا صاحب نے تو بذریعہ کشف حضرت عیسیٰ کی قبر بھی کشمیر میں دریافت کر لی ہے۔

بہرحال یہ دونوں مسائل اتنے طویل ہیں کہ ان کے تذکرہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ عیسیٰؑ کے باقی معجزات کے متعلق سید صاحب کے ارشادات سے قارئین کو ضرور مستفید فرمائیں گے۔

۷۔ حضرت عیسیٰؑ کے دوسرے معجزات

قرآن کریم میں متعدد بار حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کے ان معجزات کا ذکر آتا ہے کہ وہ مردوں کو باذن اللہ زندہ کرتے تھے مادرزاد اندھوں کو باذن اللہ بینا کر دیتے تھے۔ اور کوڑھیوں کے مرض کو دُور کر دیتے تھے۔ پرندوں کی مٹی سے شکلیں بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ باذن اللہ زندہ پرندے بن جاتے تھے۔ وہ لوگوں کو یہ بھی بتلا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا اور کیا کچھ گھر میں رکھا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ معجزات کو تسلیم کرنے کی وجہ سے سید صاحب کو علمائے اسلام سے یہ شکوہ بھی ہے کہ وہ ایسی آیات کے معنی جن میں معجزات کا ذکر ہے یہودیوں اور عیسائیوں ہی کی طرح کیوں بیان کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

"علمائے اسلام کی عادت ہے کہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے ان آیتوں کے معنی بھی وہی بیان کیے ہیں کہ حضرت عیسٰی اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے اور مُردوں کو جلا دیتے تھے (الیضاح ۲ ص ۴۴)

مثل مشہور ہے کہ پہلے کتے کو بدنام کرو۔ پھر اسے مار ڈالو۔ یہی تکنیک سید صاحب اختیار کرتے ہیں۔ خود تو جہاں ضرورت پیش آئے، بائبل کی روایات بلا تکلف پیش کر دیتے ہیں۔ مگر علمائے اسلام سے انہیں یہ گلہ ضرور ہے کہ قرآن مجید کے مفہوم کو عیسائیوں اور یہودیوں جیسا ہی کیوں ..... بیان کرتے ہیں۔ اس کی وجہ تو صاف ہے کہ قرآن بھی اللہ کا کلام ہے اور تورات بھی اللہ کا کلام ہے۔ محرف شدہ ہی سہی مگر سارا تو غلط نہیں۔ بہت سی باتیں آج بھی ان دونوں کتابوں میں ایک جیسی پائی جاتی ہیں۔ اب دیکھئے سید صاحب مردوں کو زندہ کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

"انسان کی رُوحانی موت اس کا کافر ہونا ہے۔ حضرت عیسٰی خدا کی وحدانیت تعلیم کرنے اور خدا کے احکام بتانے سے لوگوں کو اس موت سے زندہ کرتے تھے اور کفر کی موت کے نیچے سے نکال لیتے تھے جس کی نسبت خدا فرماتا ہے۔ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ (حوالہ ایضاً)

زندہ باد! مُردوں کو زندہ کرنے کا یہ انکشاف جو سید صاحب نے فرمایا ہے تو یہ کام تو سب انبیاء ہی کرتے تھے۔ اس میں بھلا حضرت عیسٰی کے خصوصی ذکر کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پیش آئی؟ پھر فرماتے ہیں کہ:۔

"اندھے لنگڑے اور چپٹی ناک والے کو یا اس شخص کو جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے کو اور کبڑے اور ٹھنگنے کو اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی یہ سب ناپاک

اور گنہگار سمجھے جاتے تھے اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق متصور نہ ہوتے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے یہ تمام قیدیں توڑ دی تھیں۔ اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے یا لنگڑے، اچوڑی ناک کے ہوں یا پتلی ناک کے اکبڑے ہوں یا سیدھے، ٹھگنے ہوں یا لمبے، پچلی والے ہوں یا جلنے والے سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی، کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا۔ کسی کو عبادت کے اعلیٰ درجے سے نہیں روکا۔ بس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھوں کا اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا تھا۔ جہاں جہاں بیماروں کا انجیلوں میں اچھا کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہی مراد ہے۔ اور قرآن مجید میں جو آیتیں ہیں ان کے بھی یہی معنے ہیں۔" (ایضاً۔ ص ۲۴۶)

بالفاظِ دیگر معجزات کی صحت کا آپ نے خود ہی ثبوت بہم پہنچا دیا۔ کہ انجیل اور قرآن ان سب باتوں کے بیان کرنے میں مشترک ہیں۔ اور ان کے متبعین بھی ان سے ایک ہی جیسے معنی و مفہوم مراد لیتے رہے ہیں۔ اور انہیں حضرت عیسیٰ کے معجزات یا خرقِ عادت امور ہی سمجھتے رہے ہیں۔ اب بھی اگر سید صاحب اپنے فہم کا قصور نہ سمجھیں تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس فہم کو غلط ثابت کرنے کی مزید ضرورت بھی نہیں۔

قرآن نے معجزہ یا نشانِ نبوت کے لیے بالعموم آیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اب تاویل کی راہیں یوں کھلتی ہیں کہ آیت اور بھی کئی معنوں میں استعمال ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) احکام شریعت:۔

تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (۲/۱۸۷)	یہ خدا کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جانا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ تاکہ وہ پرہیزگار بنیں۔

(۲) نشانِ قدرت یا دلیل:۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُونَ ○ (۵۱/۲۱-۲۰)	اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں بھی تو کیا تم دیکھتے نہیں۔

(۳) نشانِ نبوت یا معجزہ:۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ	قیامت قریب آپہنچی اور چاند پھٹ گیا اور اگر

وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ؁ (۱۵۴) کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے۔

اب دیکھئے کہ احکامِ شریعت کے ساتھ صرف مومنین کا تعلق ہوتا ہے۔ کفار کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آیاتِ قدرت جیسے زمین، آسمان، چاند، سورج، تارے بھی کافر و مومن میں باعثِ نزاع نہیں ہوتے۔ اور انہیں سب لوگ ماسوائے چند دہریت پسندوں کے نشانِ قدرت تسلیم کرتے ہیں۔ اگر کبھی اختلاف ہوا تو صرف نشانِ نبوت یا معجزہ میں۔ اور ایسے ہی نشانات پر کفار کا جھگڑا اور تکرار ہوتا ہے اور وہ اسے بالعموم جادو ہی کہہ دیتے ہیں۔ نبوت کو کبھی تو ایسے معجزات کفار کے مطالبہ سے پیشتر ہی مل جاتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصائے موسیٰ کا سانپ بننا اور ید بیضا کے معجزے پیغمبری کے ساتھ ہی مل گئے اور کبھی کفار کے مطالبہ پر ملتے ہیں۔ جیسے حضرت صالحؑ کو اونٹنی کا معجزہ کفار کے مطالبہ پر دیا گیا۔ جو پہاڑ میں سے برآمد ہوئی ارشاد باری ہے۔

وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَۃَ مُبْصِرَۃً فَظَلَمُوْا بِھَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا (۱۷/۵۹) اور ہم نے ثمود کی قوم کو اونٹنی کا کھلا نشان دیا تو انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم ایسے نشان صرف ڈرانے کے لیے بھیجا کرتے ہیں۔

اور کبھی ایسے معجزات کفار کے مطالبہ پر بھی انبیاء کو نہیں دیئے جاتے۔ چنانچہ کفارِ مکہ نے حضور اکرمؐ سے کئی بار ایسے حسی معجزات کا مطالبہ کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سے یہی جواب ملتا رہا کہ کفار سے کہہ دیجئے کہ معجزات دکھلانا میرے بس کی بات نہیں میں تو صرف ایک بندہ اور رسول ہوں اور نیز یہ کہ قرآن خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حضور اکرم کو کوئی معجزہ عطا ہی نہیں کیا گیا۔ قرآن سے حضور اکرم کے درج ذیل معجزات کا ثبوت ملتا ہے۔

رسول اللہؐ کے معجزات

۸۔ انشقاقِ قمر جس آیت سے چاند کا پھٹنا ثابت ہوتا ہے۔ وہ اوپر درج کی جا چکی ہے۔ لیکن ہمارے یہ دوست کہتے ہیں۔ کہ یہاں چاند کے پھٹنے سے مراد یہ نہیں کہ وہ فی الواقعہ پھٹ گیا تھا بلکہ مراد یہ ہے۔ قیامت کے نزدیک پھٹ جائے گا۔ جیسے آسمان بھی پھٹ جائے گا اور دوسرے اجرام بھی زیر و زبر ہو جائیں گے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل اس لیے غلط ہے۔ کہ جہاں قیامت کو ان آیات الٰہی کے پھٹنے اور زیر و

زبر ہونے کا ذکر ہے۔ وہاں کفار کے سحر کہنے کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کہیں قرآن میں ان آیات الٰہی کے ساتھ سحر کا ذکر آیا ہے۔ انشقاق کی آیت اور کفار کا اسے سحر سے تعبیر کرنا یا اس پر کفار کی تکرار ہی اس بات کی واضح دلیل ہے۔ یہ کہ ایک حسّی معجزہ ہے۔ جو وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

۹۔ معراج النبیؐ ارشاد باری ہے :۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا (۱۷:۱)

پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، سیر کرائی۔ تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھلائیں۔

مندرجہ بالا آیت میں آپ کے اس سفر کے جسمانی ہونے کے چار دلائل موجود ہیں، جو درج ذیل ہیں :۔

(۱) سُبۡحٰنَ کلمہ حیرت واستعجاب ہے اگر یہ سفر محض روحانی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔

(۲) اَسۡرٰی کا لفظ صرف جسمانی سیر کے لیے آتا ہے۔

(۳) عبد کا لفظ روح اور جسم کے مرکب پر بولا جاتا ہے۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ سفر جسمانی سفر تھا۔

(۴) اس واقعہ کے بعد کفار کی تکرار اس سفر کے جسمانی ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے اور یہ تکرار تاریخی شواہد سے ثابت ہے۔ اگر یہ سفر روحانی ہوتا تو تکرار اور جھگڑے کی نوبت ہی کہاں آتی؟

ان تمام باتوں کے باوجود سید صاحب فرماتے ہیں :۔

"اصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے معراج کی بہت سی باتیں جو خواب میں دیکھی ہوں گی لوگوں سے بیان کی ہوں گی منجملہ ان کے بیت المقدس میں جانا اور اس کو دیکھنا بھی بیان فرمایا ہوگا۔ قریش سوائے بیت المقدس کے اور کسی حال سے واقف نہیں تھے، اس لیے انہوں نے امتحاناً آنحضرتؐ سے بیت المقدس کے حالات دریافت کیے۔ چونکہ انبیاء کے خواب صحیح اور سچے ہوتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے جو کچھ بیت المقدس کا حال خواب میں دیکھا تھا۔ بیان کیا جس کو راویوں نے غلطی

اللهُ لِي بَيْتٌ فَرَفَعَهُ اللهُ لِي أَنْظُرُ إِلَيْهِ سے تعبیر کیا ہے پس اس مخاصمت سے جو قریش نے کی آنحضرتؐ کا بجسدہ اور بیداری کی حالت میں بیت المقدس جانا ثابت نہیں ہو سکتا۔" (ج ۶ ص ۹۲)

سو یہ ہے وہ آپ کی قوتِ استدلال جس پر بعد میں آنے والے قرآنی مفکرین کو آپ پر ناز ہے۔ جو "ہوگی" اور "ہوگا" سے شروع ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص یہ تہیہ کر لے کہ وہ فلاں بات تسلیم نہیں کرے گا۔ تو دنیا کی کوئی طاقت اسے بجبر تو منوا نہیں سکتی۔ بلاشبہ آپ نے مندرجہ بالا دلائل کا تجزیہ بھی کیا ہے اور پھر بھی یہی نتیجہ نکالا ہے۔ کہ یہ کوئی حسی معجزہ نہ تھا۔ مثلاً سبحان کا لفظ کلمہ تعجب تو ہے مگر یہ اسرای سے معلق نہیں بلکہ لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا سے متعلق ہے۔ نیز کفار کی مخالفت اس وجہ سے تھی کہ نبی خواہ خواب کی بات بیان کرتا یا بیداری کی ان کے لیے یکساں مابہ النزاع تھی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس سفر کے روحانی ہونے کی تائید میں حضرت ابن عباس یہ قول بھی پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اس سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰ کو معراج سے متعلق کہا ہے۔ جو یوں ہے:۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (۶۰:۱۷) اور جو نمائش ہم نے تمہیں دکھلائی اس کو لوگوں کے لیے آزمائش بنایا۔

مگر جب یہی ابن عباس آیتِ بالا کو معراج سے متعلق کہنے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ رُؤْيَا الْعَيْنِ فِي الْيَقْظَةِ (یعنی بیداری کی حالت میں آنکھوں دیکھی حقیقت) تھی تو سید صاحب حضرت ابن عباس کی یہ بات ماننے کو آمادہ نہیں ہوتے نہ ہی اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ لغوی لحاظ سے رویا کا لفظ خواب میں کچھ دیکھنے یا بیداری کی حالت میں دیکھنے دونوں طور سے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

۱۰۔ **وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى:** حضور اکرمؐ کے معجزات میں سے جو قرآن سے ثابت ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جنگِ بدر میں آپ نے ریت کی مٹھی کفار کی طرف پھینکی تو اس کے ایک ایک ذرہ نے کفار کو اندھا کر دیا۔ اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ ریت کی مٹھی تو واقعی آپ نے پھینکی تھی لیکن اس کو کفار کی آنکھوں تک پہنچا کر انہیں اندھا بنا دینا یہ اکار تھا۔ اس سے حضورؐ کا معجزہ اور خدا تعالیٰ کی قدرت دونوں باتیں قرآن سے ثابت ہوتی ہیں۔ مگر آپ ان دونوں باتوں کو ہواؤں کے رخ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اب سوال

ہوا ہے کہ اگر ہواؤں کے رخ کی ہی وجہ سے وہ ریت گئی تھی اور اس کے ذرات دشمن کی آنکھوں میں جا لگے تھے تو یہ واقعہ کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہ ظاہر ہوا پھر کیا ہواؤں کا رخ صرف جنگ بدر سے ہی مخصوص تھا کہ اس جنگ کے بعد کبھی ہواؤں کا رخ ایسا کرشمہ نہ دکھلا سکا۔

۲۔ دوسرے خرقِ عادت امور سے انکار

۱۔ کیا دعا کا کچھ فائدہ ہوتا ہے؟ قرآن کریم کے ابتداء میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی گئی ہے کہ:

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱/۵) — الٰہی ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔

پھر بیشتر مقامات پر دعا کرنے اور اس کے قبول ہونے کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ (۲۱/۷۶) — اور جب اس سے پیشتر نوحؑ نے ہمیں پکارا ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو امداد کو بڑی گھبراہٹ سے بچا لیا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (۴۰/۶۰) — اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

یہ بھی فرما دیا کہ:۔

اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) — جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

غرض قرآن کریم ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں دعا اور اس کی قبولیت کا ذکر آیا ہے کچھ مواقع تو ایسے ہیں۔ جہاں یہ ذکر ہے کہ کسی پیغمبر یا مومنوں نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما کر مطلب براری کر دی اور دوسرے مواقع ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ اللہ سے دعا کیا کریں کیونکہ اللہ ہی دعا قبول کرنے والا اور حاجت روائی کرنے والا ہے۔ اور کر دیتا ہے مگر ان سب آیات کے علی الرغم سید صاحب لکھتے ہیں۔

"دعا جب دل سے کی جاتی ہے بیشتر مستجاب ہوتی ہے۔ مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب

کے لیے ہم دعا کرتے ہیں۔ دعا کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جائے گا اور استجابت کے معنی اس کا مطلب حاصل ہو جانا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حصولِ مطلب کے لیے جو اسباب خدا نے مقرر کیے ہیں وہ مطلب تو انہی اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے مگر دعا نہ تو اس مطلب کے اسباب سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے۔ بلکہ وہ اس قوت کو تحریک کرنے والی ہے۔ جس سے اس رنج و مصیبت اور اضطراب کو جو مطلب حاصل نہ ہونے سے ہوتا ہے، تسکین دینے والی ہے (ایضاً جلد اول ص۱۸)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل سوال ابھرتے ہیں۔

(۱) کیا اللہ تعالےٰ مسبّب الاسباب ہے یا نہیں؟

(۲) اگر وہ مسبّب الاسباب ہے۔ تو دُعا کی بنا پر ہر مطلب کے حصول کے لیے کوئی سبب بنا سکتا ہے یا نہیں؟

گویا یہ بالواسطہ خدا کی قدرت سے انکار ہے۔ جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ خدا کی حقیقت اب محض ایک تماشائی کی سی ہے۔

اگر دُعا کی استجابت سے یہی مراد ہے کہ اس سے دل کو اطمینان نصیب ہو جائے۔ جو حصولِ مطلب میں ممکن تھا۔ اور یہ استجابت صرف قلبی واردات سے ہی تعلق رکھتی ہے اور خارج میں کچھ نہیں ہوتا تو مندرجہ آیت کا مطلب کیا ہوگا۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝
۵۴/ ۱۰ تا ۱۲

تو نوحؑ نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں (کفار کے مقابلے میں) کمزور ہوں تو ان سے بدلہ لے پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دہانے کھول دیئے اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے تو پانی ایک کام کیلئے جو مقدر ہو چکا تھا جمع ہو گیا۔

اب دیکھئے کہ کیا دعا کے بعد آسمان سے بے تحاشا پانی برسنا اور زمین کے چشمے مل کر طوفان کی شکل بننا اور اس طرح کربِ عظیم سے نوحؑ اور اس کے تمام ساتھیوں کو نجات دینا کیا یہ سب قلبی واردات ہیں؟

پھر ایک مقام پر سید صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

"بسا اوقات دعا کی جاتی ہے مگر حاجت براری نہیں ہوتی پس معلوم ہوا کہ دعا کوئی

سبب حصولِ مقصد کے لیے نہیں ہے۔ ورنہ ایسا نہ ہوتا"۔ (تہذیب الاخلاق ماہ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ)

اس اقتباس میں "بسا اوقات" کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ دُعا کبھی کبھار حصولِ مقصد کا سبب بن بھی جاتی ہے۔ بس یہی ہمارا مقصد ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ بسا اوقات قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کی قبولیت کے کئی موانع ہیں۔ جن کی تفصیل یہاں خارج از بحث ہے۔

نیز ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دعا کی طرح دوا بھی بسا اوقات مرض کا علاج بن نہیں سکتی۔ لیکن کبھی کبھار حصولِ مقصد کا سبب بن بھی جاتی ہے۔

دوا کا استعمال کسی جسمانی تکلیف کو دور کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اور جب تک یہ تکلیف رفع نہ ہو۔ تو مریض کو تسکین کبھی نہیں ہو سکتی اور دُعا کا دائرہ اثر دوا سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ دعا دفع مضرت اور جلب منفعت دونوں کے لیے کی جاتی ہے۔ نیز اس کا استعمال مادی اور روحانی یا ذہنی دونوں طرح کے عوارضات کے لیے ہوتا ہے۔ پھر جب تک دعا کے اثر سے ایسے عوارضات دور نہ ہوں یا نئے اسباب مہیا نہ ہوں۔ دل کو تسکین ہو کیسے سکتی ہے؟

۲۔ بنی اسرائیل کا بندر بننا :

"اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے عجیب باتیں بیان کی ہیں۔ کسی نے کہا وہ سچ مچ بندر بن گئے اور وہ سب تیسرے دن مر گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ بندر جو اب درختوں پر اچھلتے پھرتے ہیں انہی کی نسل سے ہیں مگر یہ سب باتیں لغو و خرافات ہیں۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا دن تھا۔ اور اس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارے پر رہتا تھا، فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا۔ ان کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا۔ اور ان کو قوم سے منقطع، برادری سے خارج، کھانے پینے سے الگ میل جول سے علیحدہ کر دیا۔ اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ خدا نے فرمایا ہے کُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ہیں، جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل و خوار ہیں اسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل و خوار و رسوا رہو" (تفسیر القرآن ج ۱، ص ۱۰۰)

اس تاویل پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

(۱) اگر تورات پر نہ چلنے والوں سے بنی اسرائیل پہلے سے ہی بائیکاٹ کا رویہ اختیار کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کو یہ حکم دینے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

(۲) یہ معاشرتی بائیکاٹ تو ان تین صحابہ کا بھی ہوا تھا جو جنگِ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے انھیں

تو ایسی سزا نہیں دی گئی۔ نہ ہی اس طرح کے خطاب سے نوازا گیا ہے؟

(۳) اگر محض ذلیل و خوار کرنا ہی مقصود تھا تو کئی قسم کی مخلوق بندر سے بھی زیادہ ذلیل تر ہے مثلاً کتا اور سؤر۔ جب ظاہری طور پہ ہونا ہوانا کچھ نہیں تھا تو پھر انہیں بندر ہی کہنے کی کیا تخصیص تھی!

۳۔ اللہ تعالیٰ کی مارنے اور زندہ کرنے کی قدرت:

قرآن کریم میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ۔

(البقرۃ: ۲۴۳)

بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو (شمار میں) ہزاروں ہی تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے تو خدا نے ان کو حکم دیا کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ بھی کر دیا۔ (فتح الحمید)

اس آیت میں سید صاحب "فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ" کا ترجمہ یوں پیش فرماتے ہیں:

"پھر اُن سے کہا اللہ نے مر و تم (یعنی بسبب موت کے ڈر کے یا اپنی نامردی کے اور لڑنے کے ڈر سے) پھر جلایا ان کو (یعنی ان کے دل میں شجاعت اور ارادہ جنگ پیدا کیا)"۔

(تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۱۲)

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی مارنے اور زندہ کرنے کی قدرت سے مراد صرف ذہنی تبدیلی ہوتی ہے، امر واقعہ کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ دوسرے بیشمار مقامات پر بھی سید صاحب ایسے خوارق عادت واقعات کو ذہنی تبدیلی کے حوالے کر دینے کے عادی ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل واقعات سے بھی ظاہر ہے:۔

۴۔ حضرت عزیرؑ کی موت اور زندگی:

سورۃ بقرہ میں ــــ حضرت عزیرؑ کو مارنے اور پھر زندہ کرنے کا ذکر آیا ہے۔ اس آیت کو ہم سید صاحب کے ترجمہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا

"یا (تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا یعنی اُس کا حال نہیں جانا جس نے رؤیا میں دیکھا) کہ گویا وہ گزرا ایک شہر پر ایسی حالت میں کہ وہ شہر بل گرا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ کیونکر زندہ کرے گا (یعنی آباد کرے گا) اللہ اس کو اس کے مر جانے کے (یعنی ویران ہونے کے) بعد۔ پھر اللہ نے اس کو سو برس تک مرا ہوا رکھا پھر اُس کو اٹھایا۔ خدا نے کہا کہ کتنی دیر تو پڑا رہا۔ اُس نے

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (البقرۃ : ۲۶۱)

(تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۲۴)

کہا کہ میں پڑا رہا ایک دن یا کچھ کم ایک دن کہا بلکہ تو پڑا رہا سو برس۔ پھر دیکھ اپنے کھانے کو اور اپنے پینے کو (کیا) وہ نہیں بگڑا ہے اور دیکھ اپنے گدھے کو (کیا وہ نہیں گل گیا ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ تجھ کو ایک نشانی آدمیوں کے لیے بناؤں اور دیکھ ہڈیوں کو کس طرح ہم ان کو حرکت میں لاتے ہیں۔ پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں۔ پھر جب اس کو (یہ بات) ظاہر ہوئی۔ اس نے کہا (حالت بیداری میں) میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے "

اس ترجمہ میں سید صاحب نے جو چابک دستیاں دکھلائی ہیں اس پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں :-

(۱) سید صاحب کی یہ عادت ہے کہ جس خرق عادت واقعہ میں تاویل کی کوئی گنجائش نظر نہ آئے۔ وہ اسے خواب کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے ابتدا ہی میں بریکٹوں میں (رؤیا میں دیکھا) لکھ کر اس سہل ترین طریقہ سے مطلب برآری کی ہے جس کے لیے قرآن کے الفاظ میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) اس واقعہ میں اللہ نے دو طرح کے نشانات بتلائے ہیں۔ ایک کھانے پینے کی چیزیں جن پر مرور زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بالکل ترو تازہ ہیں۔ دوسرے گدھا جس پر سو سال کی مدت گزرنے کی وجہ سے اس کی ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو گئیں۔ اگر یہ واقعہ خواب کا تصور کیا جائے تو گدھے کو بھی اسی حالت میں ہونا چاہیے تھا۔ متضاد نتائج کی کیا تک تھی ؟

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ تو کیا کسی کے خواب کے واقعات بھی اٰيَةً لِّلنَّاسِ ہو سکتے ہیں ؟

(۴) پھر جب آخر میں آپ حضرت عزیرؑ کو جگا کر ان کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ یہ فقرہ بھی وہ خواب ہی میں کہہ دیتے تو کیا فرق پڑتا تھا ؟ کیا اِنَّ اللّٰہ علی کل شیءٍ قدیر کا دائرہ صرف خواب کے واقعات تک ہی محدود ہے ؟ تو یہ قدرت کیا ہوئی یہ تو محض انسانی تخیلات ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت کا یہی آخری حصہ اس واقعہ کو عالم بیداری کا واقعہ اور معجزہ ثابت کر رہا ہے۔

۵۔ پرندوں کی موت اور زندگی :

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ سے متعلق درج ذیل واقعہ بھی بمعہ ترجمہ سید صاحب ملاحظہ فرمایئے :

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى

اور جب کہا ابراہیمؑ نے (خواب میں) اے پروردگار! مجھ کو دکھا کہ کس طرح تو زندہ کرے گا مُردوں کو، خدا نے کہا کیا تو یقین نہیں کرتا ابراہیمؑ نے کہا کیوں نہیں ولیکن میں چاہتا ہوں

كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (البقرۃ : ۲۶۰)

(تفسیر القرآن ص ۲۲۴ ج ۱)

کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔ خدا نے کہا کہ لے چار پرندے، پھر ان کے ٹکڑے کر ڈال۔ پھر رکھ ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ٹکڑا۔ پھر ان کو بلا۔ تیرے پاس چلے آئیں گے دوڑتے ہوئے۔ اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔"

اس آیت میں حسبِ عادت سید موصوف نے (خواب میں) کا اضافہ کرلیا ہے۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز حکیم (زبردست حکمت والا) کا اظہار اتنی بات سے ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کو ایسا خواب دکھلا دے ؟ فافہم وتدبر!

غرض یہ اور ایسے بیشمار واقعات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سید صاحب نے کس بیچارگی سے افکارِ مغرب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

۶۔ جنت اور دوزخ کی حقیقت :

اخروی زندگی میں نیک اعمال کے بدلہ میں جنت اور بداعمالیوں کے بدلہ میں دوزخ میں داخل کئے جانے کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد سے ہے۔ حضورِ اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی کا بیشتر حصہ مسلمانوں میں اسی عقیدہ کو راسخ کرنے میں گزارا اور صدہا آیات قرآنِ کریم میں ایسی موجود ہیں جو اُخروی زندگی میں جنت اور دوزخ کی منظر کشی کرتی ہیں۔ لیکن جنت اور دوزخ بھی چونکہ مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھتی ہیں اور عقل اور مشاہدہ کے پیمانوں سے ماپی نہیں جا سکتیں۔ لہٰذا سید صاحب جنت اور دوزخ سے مراد محض روحانی لذت اور کلفت لیتے ہیں ——— جنت اور دوزخ کے متعلق اپنی تفسیر جلد ۱ ص ۲۳ پر رقمطراز ہیں کہ،

"تمام انسانوں میں خواہ وہ سرد ملک کے رہنے والے ہوں یا گرم ملک کے، مکان کی آراستگی اور خوبی، باغ کی خوشنمائی، بہتے پانی کی دلربائی، میووں کی تروتازگی سب کے دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس کے سوا حُسن یعنی خوبصورتی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی چیز ہے، خصوصاً جبکہ وہ انسان میں ہو اور اس سے بھی زیادہ جب کہ وہ عورت میں ہو۔ پس جنت کی (قرۃ اعین) کو ان کی فطری راحتوں کی کیفیات کی تشبیہ میں اور دوزخ کے مصائب کو آگ میں جلنے اور لہو پیپ پلائے جانے اور تھوہر کھلائے جانے کی تمثیل میں بیان کیا ہے تاکہ انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ بڑی سے بڑی لذت وراحت یا سخت سے سخت عذاب وہاں موجود ہے۔ اور در حقیقت جو لذت وراحت یا رنج

وکلفت وہاں ہے۔ ان کو اس سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے۔ یہ تو صرف ایک اعلیٰ راحت واحتظاظ یا رنج وکلفت کا خیال پیدا کرنے کو اس پیرایہ میں جس میں انسان اعلیٰ سے اعلیٰ احتظاظ اور رنج کو خیال کر سکتا تھا، بیان کیا ہے۔"

"یہ سمجھنا کہ جنّت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں سنگِ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ ہیں اور سرسبز درخت ہیں۔ دودھ اور شراب کی نہریں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے۔ ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے، دوسرا چھاتی سے لپٹا رہا ہے۔ ایک نے لب جاں بخش رہایں رنش و رخش، بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ۔ بیہودہ ہے، جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔" (تفسیر القرآن۔ ج صـ ۲۳)

جنّت اور دوزخ کے خارجی وجود کا انکار:

اقتباس بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت اور دوزخ کا نہ تو کوئی خارجی وجود ہے اور نہ ہی ان کی کوئی حقیقت ہے بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جنّت اور دوزخ محض تخیلات کی دنیا کے دو مختلف پہلوؤں کے نام ہیں۔ اگر کوئی شخص خیالی جنّت میں بستا ہے تو بس یہی اصل جنّت ہے جس کا ذکر قرآن میں مختلف پیرایے میں بیان ہوا ہے۔ پھر آپ محض اس نظریہ پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جو لوگ آپ کے ہم خیال ہوں انھیں آپ تربیت یافتہ دماغ سمجھتے ہیں۔ اور جو قرآن کے الفاظ و معانی کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں، انھیں "کوڑ مغز ملّا" اور "شہوت پرست زاہد" کے القاب سے نوازتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"انہی آیات (یعنی جو جنّت و دوزخ سے متعلق ہیں) کی نسبت دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ وعدہ وعید دوزخ و بہشت کے، جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں ان سے بعینہٖ وہی اشیاء مقصود نہیں، بلکہ اس کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے۔ اس خیال سے اس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی جنّت کی اور ایک ترغیب اوامر کے بجا لانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک کوڑ مغز ملّا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پئیں گے، میوے کھائیں گے، دودھ اور شہد کی ندیوں میں نہائیں گے۔ اور جو دل چاہے گا وہ مزے اڑائیں گے۔ اور اس لغو اور بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجا لانے اور نواہی سے

بچنے میں کوشش کرتا ہے۔ اور جس نتیجہ پر پہلا پہنچا تھا اس پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور کارخانہ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے۔ پس جس شخص نے ان حقائق قرآن مجید پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں، غور نہیں کیا۔ اس نے درحقیقت قرآن کو نہیں سمجھا اور وہ اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہا۔" (ایضاً ص ۲۵)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوا کہ:

(۱) جو لوگ جنت اور اس کی نعمتوں، دوزخ اور اس کے عذاب ورنج کو ایک حقیقت سمجھتے اور واقع ہونے والا ایک امر خیال کرتے ہیں، وہ یا تو کودمغز ملاّ ہوتے ہیں یا شہوت پرست زاہد۔ یہ دونوں قسم کے لوگ حقیقتِ قرآن کو مطلق نہیں سمجھے اور نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے ہیں۔

(۲) اصل حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ اور اس کی نعمتیں یا عذاب سب کچھ تصوراتی باتیں ہیں۔ جو انسان میں ترغیب وترہیب پیدا کرنے کا کام کرتی ہیں۔ اور جو لوگ اس حقیقت کو سمجھ گئے وہی تربیت یافتہ دماغ ہیں۔ کیونکہ یہ محض نظریاتی چیزیں ہیں عملی زندگی سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔

۳) کوئی جنت ودوزخ کو محض خیالی سمجھے یا حقیقت سمجھے۔ دونوں کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔ یعنی انسان اوامر بجالاتا اور نواہی سے بچ جاتا ہے۔

خدا اور رسولؐ کے متعلق تصور؟

غور فرمائیے سید صاحب خدا اور رسولؐ کے متعلق کیا تصور پیش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ متواتر تیرہ سال جنت اور اس کی نعمتوں کے متعلق، دوزخ اور اس کی تکالیف سے متعلق آیات نازل کرتا رہا اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کی تبلیغ کر کے لوگوں کے اس تصور کو پختہ سے پختہ تر کرتے رہے۔ اس تصور کی پختگی سے مقصود یہ تھا کہ لوگ اچھے کام کریں اور برے کاموں سے بچیں۔ جب مقصد حاصل ہو گیا۔ تو اب مرنے کے بعد جنت اور دوزخ کو فی الواقعہ قائم کرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی؟ اس سے واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ خدا اور رسولؐ نے لوگوں سے دھوکا کر کے (معاذ اللہ) اور جنت ودوزخ کا تصور پختہ کر کے جب اصل مطلب حاصل کر لیا۔ تو اب اس وعدہ ووعید کو عملی شکل دینے کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ یہ اللہ کا وہ وعدہ ہے جس کے متعلق اس نے خود فرمایا ہے کہ کَانَ وَعْدُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا۔

باب (۴)

نظریۂ ارتقاء کا سرسیّد کے عقائد پر اثر

۱۔ فرشتوں پر ایمان

فرشتوں پر ایمان لانا ایمان کا ایک جزء ہے۔ اور قرآن میں اس کی صراحت کئی مقامات پر موجود ہے کہ فرشتے اپنا خارجی وجود اور ذاتی تشخص رکھتے ہیں۔ وہ فرشتے آسمان سے نیچے بھی اترتے ہیں زمین سے اوپر آسمان کو چڑھتے بھی ہیں۔ جبرئیل اور میکائیل انہی میں سے ہیں۔ پھر کچھ فرشتے دو۔ دو، تین تین چار چار پروں والے بھی ہیں۔ فرشتوں نے بدر کے میدان میں مسلمانوں کی مدد بھی کی تھی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ فرشتوں کا خارجی وجود ضرور ہے لیکن چونکہ وہ غیر مرئی مخلوق ہیں ۔۔۔ لہٰذا ان پر ایمان لانا "ایمان بالغیب" کا ایک حصہ ہے۔ لیکن سیّد صاحب موصوف فرشتوں کے خارجی وجود کے منکر ہیں، اور ان کا انکار اس بناء پر ہے کہ وہ محسوسات و مشاہدات کی زد سے باہر ہیں۔ نیز ڈاروِن کے نظریہ ارتقار کا بھی یہی تقاضا ہے۔ پھر چونکہ ابلیس بھی فرشتوں کی صف میں تھا۔ لہٰذا اس کے خارجی وجود سے بھی آپ نے انکار کر دیا۔ آپ اپنی تفسیر القرآن ج ۱ ص ۴۲ پر ارشاد فرماتے ہیں:

> "خدا تعالیٰ نے جو اپنے جاہ و جلال اور اپنی قدرت اور اپنے افعال کو فرشتوں سے نسبت کرتا ہے تو جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان قوٰے کو جو خدا نے اپنی ساری مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کیے ہیں، ملک یا ملائکہ کہا ہے جن میں سے ایک ابلیس یا شیطان بھی ہے۔ پہاڑوں کی معدنیت، پانی کی رقت، درختوں کی قوتِ نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع، غرضیکہ تمام قویٰ جن سے مخلوقات موجود ہوئی ہیں اور جو مخلوقات میں ہیں وہی ملک و ملائکہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ انسان ایک مجموعہ قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی کا ہے۔ اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذریات ہیں، جو ہر ایک قسم کی نیکی

و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور انسان کے فرشتے اور ان کی ذریّات اور وہی انسان کے شیطان اور ان کی ذریات ہیں؟" (ایضاً ص ۴۲)

سرسید کے خیالات کے مآخذ: آپ فرماتے ہیں:

"بعض اکابرِ اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں۔ اور امام محی الدین ابن عربی نے فصوص الحکم میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ شیخ عارف باللہ مؤید الدین ابن محمود المعروف بالہدیٰ نے، جو مریدانِ خاص شیخ صدر الدین قونوی، مرید امام محی الدین ابنِ عربی سے ہیں۔ شرح فصوص الحکم میں بہت بڑی بحث لکھی ہے؟" (ایضاً ص ۴۴)

یہ جو اکابرِ اسلام سید صاحب نے گنوائے ہیں۔ یہ دراصل ابنِ عربی (۶۳۸ ھ م) اور ان کے مرید خاص صدر الدین قونوی اور ان کے مرید شیخ عارف باللہ ہیں۔ ابن عربی گروہ صوفیہ کی معروف شخصیت ہیں اور صوفیہ میں شیخ اکبر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ابنِ عربی نے بھی تصوف میں چند نئے نظریات کو داخل کیا تھا۔ مثلاً

۱۔ یہ کہ نبوت وہبی نہیں بلکہ اکتسابی چیز ہے۔ اور عقل کو اپیل کرنے کی وجہ سے سید صاحب نے بھی اس نظریہ کو اپنایا ہے۔

۲۔ یہ کہ نبوت چونکہ اکتسابی ہے۔ لہذا تا قیامت جاری رہے گی۔ مرزائے قادیاں نے بھی ابنِ عربی کی تحریروں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۳۔ یہ کہ ولایت کا مقام نبوت سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق سب سے نچلا درجہ رسالت کا ہے۔ پھر اس سے اوپر نبوت کا پھر اس سے اوپر ولایت کا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

مَقَامُ النُّبُوَّۃِ فِیْ بَرْزَخٍ ! فُوَیْقَ الرَّسُوْلِ وَدُوْنَ الْوَلِیْ !

"نبوت کا مقام درمیان میں ہوتا ہے جو رسول سے اوپر اور ولی سے نیچے ہوتا ہے۔"

ابنِ عربی اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ رسول یا نبی سے تو اللہ تعالیٰ فرشتہ کے ذریعہ بات چیت کرتا ہے۔ لیکن ولی سے یہ بات چیت فرشتہ کے واسطہ کے بغیر ہوتی ہے۔ نیز نبی ہو یا رسول۔ اس کا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے جس سے آگے وہ تجاوز نہیں کرسکتا۔ جبکہ ولی واصل بحق بھی ہوسکتا ہے۔ لہذا ولایت نبوت سے افضل ہے۔

۴۔ خاتم الانبیاء کی طرح خاتم الاولیاء بھی ایک منصب ہے۔ اور چونکہ نبوت سے ولایت افضل ہے۔ لہذا خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔ اور موجودہ دور کا خاتم الاولیاء

میں ہوں۔ چنانچہ ان کا درج ذیل شعر اسی نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ ؎

اَنَا خَتْمُ الْوِلَایَۃِ دُوْنَ شَکٍّ لِوِرْثِ الْہَاشِمِیِّ مَعَ الْمَسِیْحِ!

"بیشک میں خاتم الاولیاء ہوں۔ کیونکہ مجھے ہاشمی ولایت کے ساتھ ساتھ عیسٰی ولایت بھی حاصل ہے۔"

۵۔ اور اس کا پانچواں نظریہ یہ تھا کہ انسان کو سب سے زیادہ معرفتِ الٰہی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ کسی عورت سے جماع میں مشغول ہوتا ہے۔

انہی نظریات کی وجہ سے علمائے دین نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا اور حکومتِ مصر کو اس کے خیالات سے مطلع کر دیا۔ جب اس بات کی ابنِ عربی کو خبر ہوئی تو ابنِ عربی نے وہاں سے بھاگ کر دمشق میں آکر پناہ لی۔

ابنِ عربی فلسفہ وحدت الوجود کا سب سے بڑا پرچارک تھا جو صوفیہ کا مشہور ترین نظریہ ہے اسی وجہ سے صوفیہ اسے شیخ اکبر کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے دو کتب فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی، جو خود بھی صوفیہ میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہمیں نص سے کام ہے فص سے نہیں۔ اور فتوحاتِ مدنیہ نے ہمیں فتوحاتِ مکیہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔"

سو یہ ہیں محی الدین ابنِ عربی اور ان کے مرید صدر الدین قونوی اور ان کے مرید عارف باللہ شارح فصوص الحکم۔ جن کو سید صاحب اکابرِ اسلام کا نام دے کر ان سے استفادہ فرما رہے ہیں کہ انھوں نے بھی ملائکہ کے ذاتی تشخص کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"شیخ نے اپنے مکاشفہ سے ان جزئیات کے کلیات کو جانا ہوگا۔ مگر چونکہ وہ مکاشفہ ہم کو حاصل نہیں ہے، اس لئے ہم انھیں قویٰ کو جن کو شیخ اور ان کے متبع ذریات ملائکہ قرار دیتے ہیں، ملائکہ کہتے ہیں۔ مطلب ایک ہے صرف لفظوں یا جاننے نہ جاننے کا ہیر پھیر ہے۔ شیطان کی نسبت تو قیصری شرح فصوص میں نہایت صاف صاف وہی بات لکھی ہے، جو ہم نے کہی ہے۔" (تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۴)

ان حوالہ جات سے یہ بات بہر حال واضح ہو جاتی ہے کہ سید صاحب نے فرشتوں اور ابلیس سے انکار کے ثبوت میں کس طرح کے "اکابرِ اسلام" سے استفادہ کیا ہے۔

لہ ان نظریات کے فلسفہ تفصیل اور حوالہ جات کے لیے میری تصنیف "شریعت و طریقت" ملاحظہ فرمایئے۔

سرسید اور صوفیہ کا ذہنی اتحاد:

آپ حیران ہوں گے کہ ابنِ عربی اور اُس کے مرید جو طبقۂ صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ولایت کا معیار ہی کرامات سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف سرسید جیسے نیچر پرست ہیں جو کرامات تو کیا معجزات کے بھی منکر ہیں۔ پھر یہ دونوں فرشتوں اور ابلیس کے خارجی وجود سے انکار کے مسئلہ پر متفق کیونکر ہو گئے؟ تو گزارش ہے کہ ابنِ عربی اور اس کے حواریوں کی ضرورت اور تھی اور سرسید کی ضرورت دوسری ہے۔ ابنِ عربی کا گروہ شیطان کی دشمنی سے نفس کشی، چلّے اور ریاضت مجاہدہ مراد لیتا ہے اور ملکوتی قوتوں یا ملائک کو انسان کے اندر ثابت کر کے فرشتوں کے بجائے خود آسمانوں کی طرف روحانی پرواز کرتا ہے۔ البتہ یہ گروہ خارجی قوتوں کو ملائکہ سے تعبیر نہیں کرتا۔ جبکہ سرسید کو ملائکہ اور ابلیس انسان کے اندر ہی تسلیم کرنے اور خارجی وجود سے انکار کی ضرورت یہ پیش آئی کہ اس تاویل کے بغیر نظریہ ارتقاء کو اسلامی تعلیم میں فٹ کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا دونوں گروہوں نے الگ الگ مقاصد کے پیشِ نظر فرشتوں، ابلیس اور شیطان کے ذاتی تشخص اور خارجی وجود سے انکار کر دیا۔

فرشتوں کے ذاتی تشخص کے دلائل:

اب سوال یہ ہے کہ اگر ملائکہ سے مرادِ کائنات کی مختلف خارجی قوتیں، یا انسان کے اندر نیکی پیدا کرنے والی قوتیں مراد ہیں۔ تو ان قوتوں کو مسلمان کیا ہر انسان حتیٰ کہ دہریے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر یہ فرشتوں پر ایمان بالغیب کیا ہوا؟ اور اس آیت کا مطلب کیا ہوگا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۔ (البقرۃ ۲۸۵)	رسول اس کتاب پر جو اُس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی۔ ایمان رکھتے ہیں۔ ہر ایک اللہ، اسکے فرشتوں، اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں پر ایمان لایا۔

اب دیکھئے درج ذیل آیت فرشتوں کے خارجی وجود کے ثبوت میں کیسی صاف ہے:

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰی رَبَّنَا (الفرقان ۲۱)	اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کیے گئے یا ہم اپنی آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں۔

گویا اس دور کے کفار و مشرکین فرشتوں کے خارجی وجود کے اس طرح قائل تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے خارجی وجود کے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب یہ دیا کہ:

یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ ۔ (الفرقان ۲۲)

جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن گنہگاروں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی۔

تو کیا یہ سب سوال و جواب محض خارجی یا باطنی قوتوں سے متعلق ہی ہو رہے ہیں۔ باطنی قوتیں تو کم و بیش ہر شخص میں اور ایسے ہی کفار میں بھی موجود ہوتی ہیں۔ پھر آخر ان کا مطالبہ کیا تھا؟

نیز یہ بات تو سید صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عبد کا لفظ رُوح اور جسم کے مرکب پر بولا جاتا ہے (دیکھیے تفسیر القرآن۔ واقعہ اسراء) اس کا استعمال نہ تو صرف رُوح پر ہو سکتا ہے۔ نہ صرف جسم پر اور نہ ہی خارجی یا باطنی قوتوں پر۔ اب دیکھیے قرآن کریم نے جیسے عبد کا لفظ انسانوں کے لیے استعمال کیا ویسے ہی فرشتوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وجعلوا الملئکۃ الذین ھم عباد الرحمٰن اناثا۔ (الزخرف ۱۹)

اور انھوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں سانات (خدا کی بیٹیاں) مقرر کیا۔

جبریلؑ کی حقیقت اور نبوت کا مقام:

آپ تفسیر القرآن ج ا صفحہ ۲۳ پر ارشاد فرماتے ہیں:

"نبوت درحقیقت ایک فطری چیز ہے جو انبیاء میں بمقتضائے ان کی فطرت کے مثل دیگر قویٰ انسانی کے ہوتی ہے۔ جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہے وہ نبی ہوتا ہے، اور جو نبی ہوتا ہے اُس میں وہ قوت ہوتی ہے۔ جس طرح کہ تمام ملکات انسانی اس کی ترکیب اعضاء، دل و دماغ و خلقت کی مناسبت سے علاقہ رکھتے ہیں، اسی طرح ملکہ نبوت بھی اس سے علاقہ رکھتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روئے خلقت و فطرت کے ایسا قوی ہوتا ہے کہ وہ اس کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہے۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر یا ایک طبیب بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے، مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے اور جس میں اخلاق انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ بمقتضائے اس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے۔ اور جس طرح کہ اور قوائے انسانی بمناسبت اس کے اعضاء کے قوی ہوتے جاتے ہیں، اسی طرح یہ ملکہ بھی قوی ہوتا جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنی پوری قوت پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جس کو عرفِ عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں" (ایضاً ص ۲۴)

"خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبرئیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ اس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں تجلیات ربانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا کے پاس پیغام لے جاتا ہے اور خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ خود ہی وہ مجسم چیز ہوتا ہے جس میں خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں۔ وہ خود ہی وہ مکان ہوتا ہے جو خدا کے بے حرف و بے صوت کلام کو سنتا ہے۔ خود اس کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اٹھتی ہے اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے۔ اس کا عکس اس کے دل پر پڑتا ہے جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے اس کو کوئی نہیں بلواتا، بلکہ وہ خود بولتا ہے اور خود ہی کہتا ہے: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۔۔۔۔ ہزاروں شخص ہیں جنھوں نے مجنونوں کی حالت دیکھی ہوگی وہ بغیر بولنے والے کے اپنے کانوں سے آوازیں سنتے ہیں۔ تنہا ہوتے مگر اپنی آنکھوں سے اپنے پاس کسی کو کھڑا ہوا دیکھتے ہیں ۔۔۔۔ باتیں سنتے ہیں اور باتیں کہتے ہیں ۔۔۔۔ ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ پہلا مجنون ہے اور دوسرا پیغمبر۔ گو کہ کافر پچھلے کو بھی مجنون بتاتے تھے؟" (ایضاً ص ۲۵)

"خدا نے بہت سی جگہ قرآن مجید میں جبریل کا نام لیا ہے۔ مگر سورۂ بقرہ میں اس کی ماہیت بتا دی ہے جہاں فرمایا ہے کہ جبریلؑ نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے دل پر اتارنے والی یا دل میں ڈالنے والی چیز وہی ہوتی ہے جو خود انسان کی فطرت میں ہو نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج اور خود اس کی خلقت سے جس کے دل پر ڈالی گئی ہو، جداگانہ ہو؟" (ایضاً ص ۲۵)

فطری ملکہ اور نبوت میں فرق:

سید صاحب کا یہ نادر انکشاف کئی لحاظ سے غلط ہے:

۱۔ یہ فطری ملکہ ۔۔۔۔ اگر ابتدائے فطرت سے ہوتا ہے تو اس کا اظہار بھی ابتدا ہی سے ہونا چاہیے۔ مثل مشہور ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"؟ شاعر، نابغہ اور فطین قسم کے لوگ جو ابتدائے فطرت سے یہ ملکہ لے کر پیدا ہوتے ہیں، تو ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک مدت معینہ تک تو انھیں خود بھی اور دوسروں کو بھی ان کے اس "ملکہ فطرتی" کا علم تک ہی نہ ہو اور عمر کے ایک خاص حصّہ میں اس کا پوری شدومد سے ظہور شروع ہو جائے۔ یہ چیز فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن انبیاء میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک معین مدت تک نہ انھیں خود ہی "وحی" کے نزول کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو ایسا

گمان ہوتا ہے کہ اس میں "موجی" والا فطری ملکہ موجود ہے۔

۲۔ اس فطری ملکہ کا جب ظہور شروع ہو جاتا ہے تو اس میں بدستور ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے اور وہ دو طرح سے ہوتا ہے:

(ا) اس خاص فن میں مزید کمال حاصل ہوتا ہے۔

(ب) تجربہ کی بناء پر اس کے نظریات میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

فطری ملکہ اور علامہ اقبالؒ:

اب ہم ان باتوں کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کے متعلق یہ تو مسلّمہ امر ہے کہ ان میں شعر کا فطری ملکہ موجود تھا۔ اب دیکھئے انہوں نے بچپن ہی میں کسی بچہ کو مخاطب کر کے ایک نظم کہی تھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

میں نے چھینا تجھ سے چاقو اور چلاتا ہے تو　　مہرباں ہوں میں مگر نامہرباں سمجھا ہے تو

لیکن علامہ موصوف کے آخری زندگی کے شعر بلحاظ شعریت اس نظم سے بدرجہا بلند ہیں۔ مثلاً ؎

سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے　　سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسّم آ ہی جاتا ہے

گویا اس خاص ملکہ فطری میں بھی ارتقاء و پختگی کا عمل جاری رہتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا دونوں شعروں میں بلحاظ سلاست و شعریت زمین آسمان کا فرق ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے نظریاتِ زندگی بدلتے رہے تھے۔ ایک وقت تھا جب علامہ موصوف پکے نیشنلسٹ یا وطن پرست تھے۔ اس وقت آپ نے یہ شعر کہا ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

پھر جب آپ وطن پرست کی بجائے اسلام پرست یا "مسلم" بن گئے تو آپ کا نعرہ یہ تھا ؎

چین و عرب ہمارا! ہندوستاں ہمارا!　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پھر اس نظریہ میں اس قدر پختہ ہوئے کہ مولانا حسین احمد مدنی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے انگریزوں کو وطن سے نکالنے کی خاطر کانگریس کے نظریہ کو قبول کر لیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں تو علامہ موصوف نے ان کو درج ذیل رباعی لکھ کر بھیجی ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سر منبر کہ قوم از وطن است　　چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ست

اسی طرح ایک وقت تھا جب علامہ موصوف روس کے فلسفہ اشتراکیت سے سخت متاثر تھے اس دور میں آپ نے اشتراکیت کے حق میں بہت سے اشعار قلمبند کئے۔ اور لینن کو وہ

پیغمبر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

پھر جب آپ نے اسلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو اس نظریہ اشتراکیت سے تائب ہو گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

درن آں پیغمبرِ ناحق شناس!
بر مساواتِ شکم دارد اساس

اسی طرح کسی وقت آپ تصوف سے اس قدر متاثر تھے کہ آپ کے گھر پر ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ کا درس ہوا کرتا تھا پھر جب آپ نے اسلامی تعلیمات کو اپنایا تو اس رہبانیت سے بیزار ہو کر لکھتے ہیں،

گوسفندے در لباس آدم است!	حکم او بر جان صوفی محکم است
بر تخیل ہائے او فرماں رواست	جام او خواب آورد گیتی رباست
قوم ہا از شکر او مسموم گشت	خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

غور فرمائیے کہ کیا پیغام نبوت میں بھی ایسے تغیرات کی گنجائش ہے؟ نبی بھی بہر حال انسان ہی ہوتا ہے اگر ملکۂ نبوت کی صورت بھی دوسرے ملکاتِ انسانی کی طرح ہے تو پھر یہ ان تغیرات سے کیوں کر محفوظ رہ سکتا ہے؟ قرآن کی پہلی وحی بلحاظ فصاحت و بلاغت اور ہدایت وہی درجہ رکھتی ہے جو آخری وحی کا ہے۔ پھر اس کا اپنا دعویٰ ہے کہ اس کلام میں پورے ۲۳ سال کے عرصہ میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ اس پر نہ ارتقائے فن کا کچھ اثر ہے نہ ارتقائی نظریات کا۔ پھر ہم سرسید کے اس نادر فلسفہ کو کیونکر صحیح قرار دے سکتے ہیں؟

۳۔ وحی کے متعلق یہ شعور کہ وہ ایک نبی کے دل سے اٹھتی، پھر اسی کے دل پر گرتی ہے۔ جب اٹھتی ہے تب تو اس کے منہ سے آواز نکلتی ہے۔ البتہ جب گرتی ہے اس وقت منہ سے آواز نکلنے لگتی ہے۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس کوئی موجود ہے جو اس سے ہم کلام ہو رہا ہے (جیسے قل اللہ الامر جمیعا) یعنی وہ فرضی خارجی ہستی اس نبی کو کچھ بتلا رہی ہے — اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ نبی پر وحی کے نزول کے وقت اس کے ہوش و حواس قائم نہیں ہوتے (نعوذ باللہ من ذلک)۔ یہ سوفیانہ تخیل سید صاحب کو شاید ان کے ابلیس ہی نے سمجھایا ہے۔ کسی نبی کے متعلق اس کے متبعین ایسا تصور کبھی برداشت نہیں کر سکتے

اس طرح تو وحی ساری کی ساری مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہم حیران ہیں کہ آپ نے جبریلؑ کے وجود کی نفی میں جو مجنون کی مثال کا سہارا لیا ہے۔ تو یہ بات بھی آپ کے نظریہ کے خلاف ہے۔ مجنون اسے کہتے ہیں جسے جن پڑ گئے ہوں، یا جو آسیب زدہ ہو۔ اور سر سید جن کے وہ معنی نہیں لیتے جو عام فہم ہیں۔ بلکہ وہ جن سے دیہاتی لوگ مراد لیتے ہیں (تفصیل آگے آئے گی) اب یہ عقدہ بھی سید صاحب ہی حل فرما سکتے ہیں کہ مجنوں کے سامنے جو چیز آ کھڑی ہوتی ہے اور اس سے باتیں کرتا اور مجنون سے سوال و جواب ہوتا ہے تو وہ ہستی کیا چیز ہوتی ہے؟

۴۔ پیغامبر کی یہ شرح بھی عجیب ہے کہ وہ خدا تک پیغام لے بھی جاتا ہے اور پھر وہ پیغام واپس بھی لاتا ہے تو پھر اس معاملہ میں خدا کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کیا نبی اپنا پیغام خدا کے پاس APROVE کرانے کے لیے جاتا ہے۔ آخر اس ڈبل ڈیوٹی کا فائدہ کیا ہے جو آپ نے پیغمبر کے سر پر ڈال دی ہے؟ فرماتے ہیں کہ وہ آواز بھی ہوتا ہے اور کان بھی۔ خود ہی کہتا ہے خود ہی سنتا ہے۔ اب اس میں خدا کا کیا واسطہ رہا؟ آواز تو اس کی اپنی ہی ہوتی ہے۔ پھر وہ اللہ کی بے صوت و بے حرف کلام کب سنتا ہے؟ اور اسے کیسے سمجھتا ہے؟ عجیب قسم کے گورکھ دھندا میں آپ مسلمانوں کو گھسیٹنا چاہتے ہیں۔

۵۔ یہ بے صوت و بے حرف کلام کا نظریہ خالصتہً معتزلین کا مردود نظریہ ہے۔ وہ خدا کو صفت کلام سے عاری قرار دیتے تھے۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

نبوّت اور قرآن کریم:

۶۔ اب دیکھیے قرآنِ کریم جبریلؑ اور نزول وحی کے متعلق کیا تصور پیش کرتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ
يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ
فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا
فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝
فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۝
(النجم ۳-۱۰)

اور (محمدؐ) اپنی نفسانی خواہش سے نہیں بولتا وہ خدا کی طرف سے وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ اسے بڑی زبردست قوت والے نے سکھایا۔ طاقت ور (جبریل) نے پھر وہ سیدھا اور قائم ہو گیا آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر قریب ہوا اور جھک گیا۔ پھر دو کمان کے دو گوشوں کے برابر یا اس سے بھی قریب ہو گیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو کچھ کرنا مقصود تھی۔

دیکھ لیجئے ان آیات میں وحی ڈالنے والی کسی خارجی ہستی کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟ سورۂ جن میں فرمایا کہ جب وحی اتاری جاتی ہے تو اس بنا پر فرشتے کے اردگرد پہرہ بھی لگایا جاتا ہے۔ تاکہ پوری محفوظیت سے یہ وحی نبی تک پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو۔ ایک دوسرے مقام پر پیغامبر فرشتے کو یعنی جبریل کو رُوح الامین کے لقب سے پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ پیغام رسانی میں پوری امانت و دیانت سے کام لیتا ہے۔ یہ ہے اہتمام وحی کو نبی کے دل تک پہنچانے کا۔ اب بتلائیے اس اہتمام محافظتِ وحی کو مجنونانہ تخیلات یا ماہرانہ کمالات سے کچھ نسبت ہو سکتی ہے؟

قرآن کریم میں ایک مقام پر دو فرشتوں کے نام بھی آئے ہیں۔ نام اسی چیز کا ہوتا ہے۔ جس کا کوئی علیحدہ تشخص ہو۔ اب دیکھئے ان کے متعلق سید صاحب کیا کہتے ہیں:

جبرئیل اور میکائیل:

"اس سبب سے یہود جبرئیل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور اس سے عداوت رکھتے تھے، اسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ، جو کوئی جبرئیل کا یا میکائیل کا دشمن ہے۔ بیشک خدا اس کا دشمن ہے۔ مگر جبرئیل و میکائیل کا اس آیت میں حکایۃً نام آنے سے ان کے ایسے وجود پر جیسا کہ یہودیوں نے اور ان کی پیروی میں مسلمانوں نے تصور کیا ہے، استدلال نہیں ہو سکتا" (ایضاً ص ۱۰۶)

"یہود یہ سمجھتے تھے کہ جبرئیل جو ہمارا دشمن ہے۔ وہ آنحضرتؐ کو یہ بات سکھلاتا ہے۔ خدا نے پیغمبر سے کہا کہ "تو کہہ دے کہ ہاں جبرئیل ہی اللہ کے حکم سے میرے دل میں باتیں ڈالتا ہے۔ مگر جو کوئی ان باتوں کا اور فرشتوں کا اور جبرئیل و میکائیل کا اور رسولوں کا دشمن ہے، خدا اس کا دشمن ہے۔ فرشتوں کی دشمنی بیان کرنے کے بعد جبرئیل و میکائیل کا بالتخصیص نام لینا گویا یہود کے خیالات کا اعادہ ہے، اور وہ نام مقصود بالذات نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر یہودیوں کا یہ خیال نہ ہوتا تو غالباً وہ نام نہ لیے جاتے۔ پس ان دونوں کے نام قرآن میں آنے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ در حقیقت اس نام کے دو فرشتے مع تشخصہا علیحدہ علیحدہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے زید و عمرو" (ایضاً ص ۱۴۰)

اب دیکھیے کہ بحث اس میں نہیں کہ جبرئیل و میکائیل کے نام یہودیوں نے رکھے تھے یا خدا نے؟ اگر بالفرض یہودیوں نے ہی رکھے ہوں اور خدا نے ان ناموں کا اعادہ کر دیا ہو تو بھی یہ خدا ہی کی طرف سے ہوئے۔ بحث اس میں ہے کہ آیا فرشتے اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس کے لیے سید صاحب نے کیا

دلیل وہی ہے ؛ محض اُن کے خیالات تو قابلِ تسلیم نہیں بن سکتے ۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ بات یہودیوں میں مشہور ہوگئی ۔ خواہ وہ کیسے ہوئی ۔ پھر مسلمانوں میں آگئی ۔ اگر وہ غلط تھی یعنی فرشتوں کے علیحدہ وجود کے تصورات ٹھیک نہ تھے تو اللہ تعالیٰ کو ان کی تردید کرنا چاہیے تھی ، نہ کہ اُن کا اعادہ کر کے ان غلط تصورات کو مزید تائید بخشنا چاہیے تھی ۔

۲۔ ابلیس یا شیطان

سیّد صاحب ابلیس یا شیطان کو خارجی وجود نہ ہونے کے اعتبار سے فرشتوں کی صف میں لے آئے ہیں ۔ اور ابلیس یا شیطان سے مراد لیتے ہیں ۔ انسان کی سرکش قوت یا عقل بیباک ۔ قرآن کریم سے شیطان کے متعلق دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ۔

۱۔ شیطان کی نوع ، نوعِ انسانی سے الگ ہے ۔ شیطان کا نوعِ انسانی سے کوئی تعلق نہیں ۔ جیسا کہ وہ خود خدا کے حضور اپنی برتری کے ثبوت میں کہتا ہے :

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (۷/۱۲) (اے پروردگار!) تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے ۔

۲۔ اس کی نسل بھی ہے اور اولاد کا سلسلہ چلتا ہے :

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ	(ابلیس) جنوں سے تھا ۔ اس نے اپنے پروردگار
اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ	کے حکم سے سرتابی کی ۔ کیا تم اس کو اور اس
وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۔ (۱۸/۵۰)	کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ۔

اب فرمائیے کہ نفسِ سرکش پر الگ نوع کا اطلاق ہو سکتا ہے ۔ یا اس کی اولاد کا تصور ہو سکتا ہے ؟ ہو سکتا ہے کہ بعض نکتہ سنج قسم کے لوگ شیطان کی اولاد کے مراد " اس نفسِ سرکش کے اجزاء " مراد لے لیں : جیسا کہ وہ دو دو ، تین تین اور چار چار پروں والے فرشتوں سے مراد قوت کی کمی بیشی بھی لے لیتے ہیں ۔ تو ہم عرض کریں گے کہ ایسی دور از کار تاویلات انہی لوگوں کو مبارک ۔ قرآن پہیلیوں کی زبان میں نہیں اُترا ۔ اور نہ ہی ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں کہ اس دور سے پہلے کسی نے قرآن کے حقیقی مفہوم کو سمجھا ہی نہ تھا ۔

۳۔ جِنّ

فرشتوں پر ایمان کے سلسلہ میں جنّ کا ذکر بھی از خود آ جاتا ہے ۔ فرشتوں اور ابلیس و آدم اور

خدا کا مکالمہ قرآن میں کئی بار آیا ہے۔ ابلیس گو فرشتوں میں رہتا تھا، تاہم وہ جنّوں سے تھا۔ جو فرشتوں سے علیحدہ مخلوق تھی، اور انسانوں سے بھی۔ کیونکہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اور جن آگ سے۔ اب جن بھی چونکہ غیر مرئی مخلوق ہے۔ لہٰذا اس سے بھی سید صاحب نے انکار کر دیا۔ دلیل یہ ہے کہ جن کے معنی پوشیدہ اور اس کا تصور ذہن کو کسی قدر اور ہولناک صفت کی طرف منتقل کرتا ہے۔ لہٰذا لفظ جن کا اطلاق ان انسانوں پر ہوتا ہے جو آبادیوں سے دور صحراؤں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور شہری لوگوں سے زیادہ طاقتور اور ڈیل ڈول میں زیادہ قوی اور مضبوط تھے۔ چنانچہ سید صاحب اُن جنّوں سے، جو سلیمانؑ کے لیے قلعے بناتے، محل اور تالاب وغیرہ بناتے تھے، دیہاتی ہٹے کٹے قسم کے صناع مُراد لیتے ہیں۔

اب دیکھئے قرآنِ کریم میں دیہاتیوں کے لیے الاعراب اور دیہاتی آبادیوں کے لیے بَدو کا لفظ آیا ہے۔ امام راغب صاحب مفردات القرآن کہتے ہیں کہ "جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ (یوسف) آپ کو گاؤں سے یہاں لا یا) میں بَدو یعنی بادیہ (صحرا) ہے۔ اور ہر وہ مقام جہاں بلند عمارات وغیرہ نہ ہوں اور تمام چیزیں نظر آتی ہوں اسے بَدو (بادیہ) کہا جاتا ہے۔ اور البادی کے معنی صحرا نشین کے ہیں۔"

گویا سر سید تو دیہاتیوں کو نظروں سے اوجھل کر کے انھیں جن کہتے ہیں۔ جبکہ امام راغب انھیں خوب نمایاں کر کے انھیں دیہاتی کہتے ہیں۔ اور قرآن امام راغب کے قول کی تائید کرتا ہے۔

جنّوں کی آگ سے تخلیق کے بارے میں سید صاحب فرماتے ہیں کہ:

"قوائے بہیمیہ یعنی جن کا مبدا حرارت غریزی و حرارت خارجی ہے، آگ سے مخلوق ہونا ٹھیک ٹھیک ان کی فطرت بتلاتا ہے۔" (ایضاً ص ۵۸)

اب دیکھیے حرارت غریزی انسان میں اس وقت سب سے زیادہ ہوتی ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے اور جوں جوں وہ بڑا اور پھر بوڑھا ہوتا جاتا ہے، یہ حرارت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے اس وقت وہ پورا شیطان یا ابلیس یا جن ہوتا ہے۔ اور جوں جوں وہ ارذل العمر کو پہنچتا جاتا ہے وہ انس یا انسان بنتا جاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر بچپن میں ہر انسان کا جن خوب ہٹا کٹا اور طاقتور ہوتا ہے اور جوانی میں اسے بہرحال کمزور ہو جانا چاہیئے۔ یہ بات بھی مشاہدہ کے خلاف ہے۔

اب دیکھئے درج ذیل آیات ابلیس اور جنّوں کے خارجی وجود کے متعلق کتنی صاف ہیں:

ابلیس کے خارجی وجود کا ثبوت:

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (۱۵/۳۴) (اللہ نے ابلیس سے) فرمایا جنت سے نکل جا۔ تو مردود ہے۔

ذرا سوچیے، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم آدمؑ کے سرکش جذبات کو دیا تھا؟

اور دوسرے مقام پر ہے۔

فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ ۝ وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ ۝ (۲۶/۹۴-۹۵)
تو وہ بھی اور گمراہ لوگ بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اور ابلیس کے سارے لشکر بھی۔

جنوں کے خارجی وجود کا ثبوت:

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝ (۳۷/۱۵۸)
اور انہوں نے خدا اور جنوں میں رشتہ مقرر کیا۔ حالانکہ جنات جانتے ہیں کہ وہ خدا کے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔

اب ظاہر ہے آج تک کسی جاہل سے جاہل قوم نے دیہاتی لوگوں یا سرکش جذبات کو خدا کا رشتہ دار نہیں بنایا۔ بقول پرویز صاحب اب یہ بجز ت پرست یا دیوی دیوتا ہی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں وہی اشیاء بھی مراد نہیں لی جا سکتیں۔ کیونکہ وہمی اشیاء کا علم و شعور سے کیا تعلق؟ لہٰذا واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ جن کوئی علیحدہ مخلوق ہے۔ جو آج بھی موجود ہے۔ اپنا ذاتی تشخص بھی رکھتی ہے اور علم و شعور بھی۔

۴۔ قصہ آدمؑ و ابلیس

فرشتوں، ابلیس، شیطانوں اور جنوں کے خارجی وجود سے انکار کے بعد اب سید صاحب آدمؑ کی طرف توجہ فرماتے اور آدم کی تشریح ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے۔ جس کو عوام الناس اور سید کے ملا بلا آدم کہتے ہیں۔ بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے۔ جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاستار میں لکھا ہے۔ "ھو یا المقصود بآدم آدم وحدہ" ۔۔ اور خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے "لَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ" پس "کم" کا خطاب کل انسانوں کی طرف ہے۔ اور آدم سے بنی آدم یعنی نوع انسانی مراد ہیں"

اقتباس بالا میں لفظ آدم کی یہ تشریح پیش کر کے سید صاحب نے مکمل طور پر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے لیے راستہ ہموار کر لیا ہے۔ آدمؑ کی اس نئی تشریح میں آپ نے مشہور و معتبر تفاسیر کو نظر انداز کر کے کسی مجہول تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاستار کا سہارا لیا ہے۔ صاحب تفسیر کا نام آپ نے صحیح نہیں فرمایا کہ اس پر کچھ تبصرہ کیا جاتے۔ البتہ تفسیر کے نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تفسیر نے قرآن کو اسرار و رموز کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے۔ اور مصنف صاحب ان سربستہ رازوں کو کھولنے اور پردوں کو ہٹانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ تاہم جو اسرار انہوں نے بیان فرمائے وہ سید صاحب کے مطلب کی چیز تھی۔ باطنی فرقہ کے لوگوں نے بھی قرآن کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔ یا پھر اگر صاحب تفسیر القرآن کے تتبع میں سید صاحب

بھی یہی کچھ کرلیں تو کیا مضائقہ ہے۔

رہی یہ بات کہ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ سے یہ سمجھنا کہ آدمؑ سے پہلے بنی نوعِ انسانی یا بنی آدم بکثرت موجود تھے تو یہ کئی لحاظ سے غلط ہے:

۱۔ جہاں بنی آدم کے تذکرہ کی ضرورت تھی وہاں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ آدمؑ کا قصہ قرآن میں بیسیوں مقامات پر مذکور ہے لیکن کسی جگہ بھی آدمؑ کے بدل بنی آدم کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ آدمؑ سے مراد بنی نوعِ انسان یا بنی آدم کا نمائندہ نہیں بلکہ مخصوص فردِ واحد ہے۔

۲۔ یہ آدمؑ ایک برگزیدہ انسان تھے اور ان کا ذکر چونکہ حضرت نوحؑ کے ساتھ ہوا ہے لہٰذا ظن غالب یہی ہے کہ وہ نبی تھے۔ ارشادِ باری ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳/۳۳)	بیشک خدا نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمایا تھا۔

۳۔ درج ذیل آیت حضرت آدمؑ کی نبوت پر واضح دلیل ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ۔ البقرہ (۲/۳۷)	پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔

مندرجہ بالا آیت میں "فَتَابَ عَلَيْهِ" کے الفاظ اس بات پر شاہد ہیں کہ یہاں کوئی اصول نہیں بیان کیا جارہا، بلکہ کسی فردِ واحد کی توبہ کی قبولیت کی اطلاع دی جارہی ہے۔ جو بغیر وحی کے ممکن نہیں۔ لہٰذا حضرت آدمؑ فردِ واحد اور برگزیدہ انسان اور نبی تھے۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدمؑ سے پہلے بنی آدمؑ موجود نہیں ہو سکتے۔ اب ہم جناب سید صاحب کی اس دلیل کا جائزہ لیتے ہیں جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔ (۷/۱۱)	"اور بیشک ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔"

اس آیت میں "ثُمَّ قُلْنَا" کے لفظ سے آپ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس قصہ آدمؑ سے پیشتر بنی نوعِ انسان موجود تھے۔ جن کے لیے جمع کا ضمیر کُمْ استعمال ہوا ہے۔ یہ آیت سورہ اعراف کی نمبر ۱ ہے مضامین میں سے کسی آیت کا ٹکڑا پیش کر کے مقصد برآری کوئی مستحسن فعل نہیں ہوتا۔ اس آیت کے مخاطب دورِ

ہوئی کے لوگ ہیں۔ اگر سورہ کو شروع سے پڑھ لیا جائے تو ذہن خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ آیت ۳ سے
مستقل مضمون چلا آرہا ہے اور وہ یوں شروع ہوتی ہے :

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷/۳) ۔ لوگو! جو کتاب تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو :

تو یہاں لفظ خلقناکم سے مراد حضرت آدمؑ ہیں۔ لیکن مخاطب چونکہ عوام الناس ہیں۔ جو کہ بنی آدم ہی ہیں۔ اس لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جب فاعل یا مفعول ایک یا ایک سے زیادہ ہوں۔ تو ضمیر واحد بھی استعمال ہو سکتی ہے اور جمع کی بھی۔ جیسا کہ قرآن میں قصۂ موسیٰ و خضر میں استعمال ہوئی ہیں۔ حضرت خضر موسیٰؑ کو تینوں واقعات کی تاویل بتلاتے ہیں۔ تو پہلے واقعہ کے لیے اَرَدْتُّ واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اور دوسرے واقعہ کی تاویل بیان کرتے وقت فَاَرَدْنَا جمع متکلم کا۔ حالانکہ کشتی توڑنے میں خدا اور اس کی مشیت کو بھی ایسا ہی دخل تھا جیسے لڑکے کو مار دینے میں۔

قصۂ آدم میں گفتگو کے فریق :

پھر سید صاحب فرماتے ہیں کہ :

"اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں، ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی قوائے ملکوتی)۔ تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ ان قویٰ کا ہے۔ اور جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں) مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبانِ حال سے انسان کی فطرت بیان کرنا ہے۔ خدا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ گویا قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنے والا ہوں۔ مگر وہی میرا نائب ہونے کے لائق ہے۔ جب میں اس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اس کو سجدہ کرنا۔ اس مقام پر مخاطبین کو (یعنی قوائے ملکوتی کو مؤلف) اس بات کا کہ اس مخلوق (یعنی انسان) میں قوائے بہیمیہ (یعنی ابلیس یا شیطان بھی موجود ہوں گے) عالم قرار دیا گیا ہے۔ اور بمقتضائے فطرت ان قویٰ کے، انھوں نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ کرے گا۔ جو زمین پر فساد مچائے اور خون بہائے اور قوائے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں۔ اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں"۔ (ایضاً ص۴۹)

اب دیکھیے کہ جو منظر کشی سید صاحب نے پیش فرمائی ہے۔ اس میں نہ وہ فرشتوں کا خارجی وجود تسلیم کرتے ہیں نہ ابلیس یا شیطان کا۔ باقی رہ گئے دو یعنی خدا اور انسان، خدا بھی غیر مرئی ہستی ہے۔ اب میدان میں صرف ایک فریق یعنی انسان رہ گیا۔ وہ بھی کوئی متعین ہستی نہیں۔ پھر اس کا زمانہ بھی انسانی

گرفت سے ماورا ہے۔ تو یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن نے جو اس واقعہ کو بیسوں مقامات پہ دُہرایا ہے۔ تو کیا یہ محض ایک ڈرامہ ہی تھا؟ چلیے ہم اسے سید صاحب کے بقول تمثیل یا ڈرامہ ہی سمجھ لیتے ہیں، تو کیا کبھی ایسا ڈرامہ بھی منظر عام پہ آیا ہے جس کا کوئی معیّن کردار بھی میدان میں موجود نہ ہو؟

جنت، شجر ممنوعہ اور ہبوطِ آدم کی تاویلات:

جنت کے متعلق ـــ جس میں آدم اور اس کی بیوی کو رہنے کو کہا گیا تھا ـ اختلاف تو رہا ہے کہ آیا وہ جنت آسمانوں پہ تھی یا زمین پر؟ کیونکہ ہبوط کے معنی گرنا اور گرانا کے بھی آتے ہیں، تو بے آبرو ہو کر نکلنے اور نکالنے کے بھی۔ معتزلہ یا کچھ دوسرے لوگ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ یہ جنت زمین پر تھی حتیٰ کہ معتزلہ نے اس کی جگہ بھی بتلا دی کہ وہ فلسطین میں یا فارس و کرمان کے درمیان تھی۔ لیکن سید صاحب نے اس واقعہ کی جو تاویل فرمائی ہے۔ وہ بس اپنا جواب آپ ہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس کے بعد خدا نے انسان کی زندگی کے دونوں حصّوں کو بتایا ہے۔ پہلے حصّہ کو جس جگہ انسان غیر مکلف اور تمام قیود سے مبرا ہوتا ہے، بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میووں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے۔ اور جب دوسرا حصّہ اس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہے، تو اس کے قدیم دشمن (شیطان) کو پھر بلایا ہے۔ جس نے اس کو بہکا کر درخت ممنوعہ کھلایا ہے۔"

"یہ وہ حصّہ انسان کی زندگی کا ہے جبکہ اُس کو رُشد ہوتا ہے اور عقل و تمیز کے درخت کا پھل کھا کر مکلف اور اپنے تمام اقوال و افعال و حرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ زندگی کے ضروری سامان کے لیے خود محنت کرتا ہے اور نیک و بد کو خود سمجھتا ہے۔ اپنی برائی سے واقف ہوتا ہے اور اس کو چھپاتا ہے۔ یہ فطرتِ انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے۔ سن رشد و تمیز کو پہنچنے کو درخت، معرفت خیر و شر کو پھل کھانے سے اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت (جنت یا بچپن کی عمر کے درختوں) کے پتوں کے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے۔ مگر شجرۃ الخلد تک اُس کو نہیں پہنچایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فانی وجود ہے اور اُس کو دائمی بقا نہیں! اخیر کو نہایت عمدگی سے اس کا خاتمہ بیان کیا ہے کہ تم سب نکل جاؤ اور جا کر زمین پر رہو۔ یہی تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اسی میں تم رہو گے، اسی میں مرو گے، اُس میں سے اٹھو گے۔" (ایضاً۔ ص ۵۹)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ جنت سے مراد سِن بلوغت سے پہلے کی عمر ہے، جسے بادشاہی عمر بھی کہتے ہیں۔

۲۔ شجرِ ممنوعہ سن بلوغت کو پہنچ جانے کا نام ہے۔
۳۔ جب کوئی انسانی بچہ اس سن بلوغت کو پہنچ جاتا ہے تو شیطان آموجود ہوتا ہے۔
اور اسی وقت یہ مکالماتی ڈرامہ — جو چار کرداروں پر مشتمل ہے — پیش آتا ہے۔
۴۔ سن بلوغت سے بعد کی عمر ہی ہبوط آدم ہے۔ پھر جو کوئی شجرِ ممنوعہ کو چکھ لیتا ہے تو اُسے اپنی بدی کو سن بلوغت سے پہلے کی عمر کے پتوں سے چھپانا پڑتا ہے۔ اور اگر
۵۔ نہایت عمدگی سے بیان کیا جائے تو ہبوطِ آدم سے مراد زمین پر رہنا ہے۔

تاویلات کا جائزہ :

اب دیکھئے ان تاویلات پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں :

۱۔ سن بلوغت سے پہلے ہر انسان اکیلا ہوتا ہے۔ اس بادشاہی یا جنت کی زندگی میں اس کے زوج کا تصور ناممکن ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے آدم اور اس کی بیوی دونوں کو جنت میں رہنے کو کہا تھا۔ اس لیے یہ تاویل غلط ہے۔

(۲) شجرِ ممنوعہ کو کھانے یا نہ کھانے کا آدم کو اختیار دیا گیا تھا مگر سید صاحب کے شجرِ ممنوعہ (سن رشد و تمیز) کو کھانے پر ہر انسان اپنے طبعی تقاضوں کے تحت مجبور ہوتا ہے۔ ورنہ ان میں اکثر اس ذمہ داری کی زندگی کو قبول ہی نہ کرتے اور ہمیشہ بادشاہی عمر یا جنت میں ہی رہنا پسند کرتے۔

(۳) شجرِ ممنوعہ کو آدم اور اس کی بیوی نے شیطان کے بہکانے پر چکھا تھا مگر اس تاویل کے تحت ہر کوئی مرد ہو یا عورت (بلا شرط زوجین) از خود چکھتا ہے کیونکہ وہ اس پر مجبور ہوتا ہے۔

(۴) مکلفانہ زندگی میں قدم رکھنا انسان کا طبعی تقاضا ہے اور طبعی تقاضوں پر ہبوط یا بے آبروئی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

۵۔ نہایت عمدگی سے بیان کے مطابق ہبوطِ آدم سے مراد انسان کا زمین پر رہنا ہے۔ تو کیا ہبوط سے پہلے کی زندگی (یعنی جنت یا بچپن کی زندگی) میں انسان زمین پر نہیں رہتا تھا؟ پھر یہ ہبوط کیا ہوا؟
سو یہ ہیں سر سید مرحوم کی تاویلات کے نمونے۔ پھر آپ نے ان تاویلات میں جو ذہنی کاوش صرف کی اُس کی ہم داد ہی دیں گے۔ کیونکہ ان تاویلات سے آپ نے مجربات کو مطابق فطرت بھی کر دکھلایا ہے اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق بھی۔ قرآن کریم میں ایسے اسرار و رموز کی حکمت آپ یہاں فرماتے ہیں کہ :

"اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالیٰ انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوائے بہیمیہ اس میں ہیں۔ ان کی بُرائی یا ان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرتا ہے

مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا۔ جو عام لوگوں کے اور اونٹ چرانے والوں (یعنی صحابہؓ) کے فہم سے بہت دور تھا اس لیے خدا نے انسانی فطرت کی زبانِ حال سے، آدم و شیطان کے قصے، خدا اور فرشتوں کے مباحثہ کے طور پر اس فطرت کو بیان کیا ہے تاکہ ہر کوئی خواہ اس کو فطرت کا راز سمجھے، خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ، خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا، اصل عقیدہ حاصل کرنے سے محروم نہ رہے۔ اس پر عام و خاص، سمجھدار اور نا سمجھ، جاہل و عالم کا یکساں قرآن مجید سے مقصد پانا درحقیقت بہت بڑا معجزہ قرآن کا ہے۔"
(ایضاً ص ۴۶)

سمجھے آپ کہ سید صاحب اس معجزہ قرآن کی آڑ میں کیا فرما رہے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) قرآن میں جو بیسیوں مقامات پر قصہ آدم و ابلیس اور فرشتوں کا بیان ہوا ہے۔ تو اس سے مراد صرف فطرتِ انسانی کا سمجھانا مقصود تھا۔

(۲) فطرت انسانی کا سمجھانا بہت دقیق راز ہے۔ جو دوسرے آسان الفاظ میں ادا نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا بار بار یہ قصہ دہرا کر اہلِ دانش کو سمجھانا ضروری تھا۔

(۳) یہ راز اتنا دقیق ہے جو عام لوگوں اور اونٹ چرانے والے (صحابہ کرامؓ) کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

(۴) اور جن لوگوں نے اس راز کو دریافت کر لیا ہے۔ وہی عالم، دانشمند اور خاص لوگ ہوتے ہیں جیسے سرسید اور اُن کے ہمنوا لوگ۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)۔

سرسید پر کفر کا فتویٰ:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے دل میں مسلمانوں کے لیے درد بھی تھا اور خلوص بھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان قوم ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد حکمران انگریز طبقہ کی نظروں میں مجرم اور مقہور تھی۔ اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک نے انگریزوں کو اور بھی غضبناک بنا دیا تھا۔ ان حالات میں سید صاحب نے ان دونوں حلقوں کو قریب تر کرنے اور آن میں مفاہمت کی فضا ہموار کی اور ان کوششوں میں اپنی جان اور مال تک کھپا دیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس کشمکش میں خود آپ نے اور مسلمانوں نے جہاں کچھ مادی فوائد حاصل کیے وہاں ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی پہنچا کہ آپ نے نہ صرف خود کو مغربی تہذیب و افکار کی جھولی میں ڈال دیا بلکہ مسلمانوں کو بھی اس راہ پر گامزن کر کے اسلام کے بنیادی تصورات اور ایمان بالغیب کی بیشتر کڑیوں کی جڑیں تک ہلا دیں۔ اور ہر ایسے واقعہ یا تصور پر دھاوا بول دیا، جو مغربی افکار و نظریات کی میزان پر پورا نہیں اترتا تھا۔ معجزات سے انکار یا ملائکہ، وحی، نبوت

اور دوسرے کئی مسلمات سے متعلق ایک نئے تصور کی تخلیق اسی ذہنی شکست خوردگی کے نتائج و آثار ہیں۔ نتیجتاً مسلمانوں کے تمام فرقوں نے آپ کی اسی نیچریت کی بنا پر متفقہ طور پر ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا چنانچہ ادارہ "طلوعِ اسلام" اس فتویٰ پر یوں تبصرہ لکھتا ہے کہ :

"طرفہ تماشا یہ ہے کہ مختلف مذہبی فرقوں کے وہ اجارہ دار جو دین خدا کے کسی اصول پر کبھی متفق نہ ہو سکے اور ہمیشہ دوسرے فرقہ کو کافر سمجھا کئے۔ ان کا اجماع ہوتا ہے تو اس دیوانۂ ملت کی تکفیر پر جس نے کڑے اور نازک مرحلے پر پوری ملت کو موت سے بچا کر نئی زندگی عطا کی" (پاکستان کا معمار اول ص ۸۳)

اس تبصرہ میں کئی باتیں حقیقت کے خلاف ہیں۔ مثلاً :

۱۔ مسلمانوں کی اکثریت نے اصولوں میں آج تک اختلاف نہیں کیا بلکہ اگر کوئی شخص اصولوں میں اختلاف کرے تو اکثر فرقے اپنے فروعی اختلاف کے باوجود اس کی تکفیر پر متحد ہو جاتے ہیں خلاً حسین بن منصور حلاج، یا مرزا غلام احمد قادیانی یا سر سید کی تکفیر پر۔ پھر یہ اتحاد صرف مسئلہ تکفیر پر ہی نہیں اور بھی بیشتر اجتماعی امور پر ہو جاتا ہے۔ مثلاً پاکستان کی تشکیل یا قرارداد مقاصد یا تحریک ختم نبوت یا نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ پر مسلمانوں کے اکثر فرقوں میں فروعی اختلافات کے باوجود اصولوں پر بالعموم اتفاق ہو جاتا رہا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے فرقوں نے فروعی اختلافات کی بنا پر کبھی ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی حنفی، شافعی مالکی اور حنبلی سب فروعی اختلافات کے آئینہ دار فرقے ہیں۔ لیکن سب ایک دوسرے کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں۔

۳۔ فتویٰ تکفیر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کے جملہ فرقے کسی ایک شخص یا فرقہ کو گمراہ بدعتی یا کافر قرار دیں۔ ایسا فتویٰ یقیناً اپنے اندر پورا وزن رکھتا ہے۔ دوسری یہ کہ ایک فرد اور یا کوئی ایک فرقہ دوسرے تمام فرقوں کو گمراہ اور کافر قرار دے دے۔ جیسے مرزا قادیانی یا ان کا فرقہ دوسرے تمام مسلمانوں کے متعلق ایسا عقیدہ رکھتا اور فتویٰ لگاتا ہے تو ایسا فتویٰ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ کافر یا گمراہ کہنے والا فرقہ خود ہی کافر یا گمراہ ہوتا ہے۔

امت کے اکثر فرقوں کا فیصلہ بالعموم صحت پر مبنی ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ لہٰذا سر سید کے خلاف امت کا اکثریتی فتویٰ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ صاحبِ موصوف اسلام کے اصولی عقائد و نظریات پر حملہ آور ہو سکتے تھے اور اس بات کی بھی کہ اس گئے گزرے دورِ انحطاط میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کو مادی ترقی کے بجائے اصولِ دین کی حفاظت عزیز تر ہے۔

سرسید کے افکار و نظریات پر ایک نظر

پیشتر اس کے کہ ہم سید صاحب کے اپنے مخصوص نظریات کا جائزہ لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ معتزلہ کے مخصوص عقائد و نظریات سے کس حد تک متاثر تھے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ معتزلہ کے مخصوص نظریات مندرجہ ذیل امور تھے:

(۱) عقل کا تفوق اور برتری۔ اسی بنا پر وہ احادیث اور اجماع کا انکار کرتے تھے۔ اور اسی عقلی تفوق کی بنا پر وہ قرآنی آیات کی دور از کار تاویلات پر مجبور ہو جاتے تھے۔

(۲) ذات و صفات باری تعالیٰ میں امت مسلمہ کے مسلمہ عقائد سے اختلاف رکھتے تھے۔ وہ خدا کے لیے سمت مقرر کرنے یا اس کی طرف ہاتھ یا پاؤں کی نسبت کرنے کو کفر سمجھتے تھے۔ اور صفات باری تعالیٰ کو حادث سمجھتے تھے۔ اور جو صفات کو بھی قدیم تصور کرتا اسے مشرک قرار دیتے تھے۔

(۳) جبر و قدر کے معاملہ میں وہ قدریہ عقائد کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ خدا کائنات اور قوانین قدرت بنانے کی حد تک مختار تھا۔ اب جبکہ اس نے قوانین قدرت بنا دیئے ہیں، تو اب وہ خود بھی اپنے وعدہ کے مطابق" ان کا خلاف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا انہی قوانین قدرت جن میں سے ایک مکافات عمل بھی ہے۔ انسان اپنے اچھے و برے کی سزا و جزا پانے پر مجبور ہے۔ لہٰذا وہ اللہ کی صفت مغفرت کی تاویل کر لیتے تھے اور شفاعت سے یکسر انکار کر دیتے تھے۔

سید صاحب کی تفسیر القرآن کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ بھی بعینہٖ ان نظریات میں معتزلہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ آپ کے درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

(۱) پہلا نظریہ، عقل کا تفوق:

آپ قرآن کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ،

"ان سب باتوں کے ہونے کے بعد (وہ کیا باتیں ہیں، آگے چل کر ہم بیان کریں گے) اس بات کا جاننا بھی ضرور ہے کہ جس بات پر منقول دلیل دلالت کرتی ہے اس پر کوئی عقلی معارضہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی عقلی معارضہ پایا جائے گا تو ضرور عقلی دلیل ہی اس کو ترجیح ہوگی اور اس نقلی دلیل کو ضرور دوسرے معنوں میں تاویل کرنا پڑے گا" (ج ۱ ص ۱۹)

اقتباس بالا میں آپ نے کس قدر وضاحت سے اعتراف فرما لیا ہے کہ اگر قرآن کی کوئی بات عقل کے خلاف معلوم ہو تو لامحالہ اس کی تاویل کرنا چاہیے۔

(۲) دوسرا نظریہ، ذات و صفات باری تعالیٰ کی تنزیہہ:

اس سلسلہ میں سرسید صاحب کی اقتباس بالا کے ساتھ ہی ملحقہ عبارت ملاحظہ فرمایئے جو

عقل کے خلاف انھیں معلوم ہوئی:

"مثلاً یہ جو خدا کا قول ہے "الرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" یہ صاف دلالت کرتا ہے کہ خدا تخت پر بیٹھا ہوا ہے مگر دلیل عقلی اس کی معارض ہے۔ . . . . . .

. . . . اور خدا کا تخت پر بیٹھا ہوا ہونا عقلی دلیل سے محال ہے۔ اس لیے اس نقلی دلیل کی غلبہ یا بادشاہت سے تاویل کی گئی، اور اگر یوں نہ کیا جائے تو اجتماع نقیضین یا ارتفاعِ نقیضین لازم آتا ہے۔ اور اگر دلیل نقلی کو عقل پر ترجیح دیں تو فرع سے اصل کا ابطال لازم آتا ہے۔ کیونکہ جو چیزیں نقلی ہیں ان کا اثبات بھی بجز عقل کے اور کسی طرح ممکن نہیں۔ پس نقل کے لیے بھی عقل ہی اصل ہے" (ایضاً ص ۱۱۹)

(۳) تیسرا نظریہ، جبر و قدر:

اس مسئلہ میں سید صاحب نہ جبریہ سے اتفاق کرتے ہیں نہ قدریہ سے۔ اور نہ ہی عام مسلمانوں سے جو بین الجبر والاختیار کے قائل ہیں۔ آپ نے اس مسئلہ کو چھیڑ کر لاینحل ہی چھوڑ دیا ہے۔ تینوں سابقہ نظریات کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ لیکن کسی ایک کی بھی تائید نہیں کی اور نہ ہی اپنا کوئی واضح نظریہ پیش کیا ہے تاہم اس طویل بحث سے جو تفسیر القرآن ج اص ۷۹ سے ۷۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ جبر کی طرف مائل ہیں اور آپ نے جمہور ائمہ اسلام سے اختلاف کے حق کو ضائع نہیں کیا۔

(۴) چوتھا نظریہ، خوارقِ عادت اور معجزات سے انکار:

معجزات سے انکار کے متعلق بھی آپ کا نقطۂ نظر ملاحظہ فرمایئے:۔

"قرآنِ مجید کے معانی بیان کرنے میں سب سے زیادہ دھوکا انسان کو ان مقامات پر پڑتا ہے جہاں قرآن میں قصص انبیائے سابقین بیان ہوئے ہیں۔ انبیائے سابقین کے قصے عہد عتیق کی کتابوں (تورات) میں بھی آئے ہیں۔ اور علمائے یہود نے بھی قصص انبیاء مستقل کتابوں میں لکھے ہیں۔ جن میں بہت کچھ باتیں دور از عقل و خلافِ قانونِ قدرت کے ہیں۔ وہ قصے مشہور تھے اور ہمارے علماء بھی ان سے مانوس تھے اور ان کے عجائبات کو جو قانونِ قدرت کے خلاف تھے معجزات قرار دیتے تھے۔ وہ قصے قرآن میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ اور وہ بیان بہت کچھ اس کے مشابہ اور مماثل ہے جو ان معنوں کی نسبت بیان ہوا ہے۔ مگر قرآن مجید کے الفاظ ان قصوں میں اس طرح آئے ہیں کہ ان سے وہ باتیں جو دور از عقل اور خلافِ قانونِ قدرت ان قصوں میں مشہور تھیں، ان کا ثبوت نہیں ہوتا۔ ہمارے علمائے متقدمین نے اس بات پر خیال نہیں کیا بلکہ ان سے جہاں تک ہو سکا، قرآن مجید

کے الفاظ کو ان پر بعینہٖ محمول کرنے کی کوشش کی اور اس کے کئی سبب تھے :
اوّل : یہ کہ ان قصّوں کی نسبت کیفیت مشہورہ اُن کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ اس لئے قرآن مجید کے الفاظ پر انھوں نے توجہ نہیں کی۔
دوسرے یہ کہ اُن کے پاس ہر ایک چیز گو کہ وہ کیسی ہی قانونِ فطرت کے خلاف کیوں نہ ہو خدا کی قدرت عام (یعنی انّ اللّٰہ علی کل شئی قدیر (للمؤلف) کے تحت میں داخل کر دینے کا نہایت سہل طریقہ تھا۔ اور اس سبب سے ان الفاظ کی حیثیت پر غور کرنے کو توجہ مائل نہ ہوتی تھی۔
تیسرے یہ کہ اُن کے زمانہ میں نیچرل سائنس نے ترقی نہیں کی تھی۔ اور کوئی چیز ان کو قانون فطرت کی رجوع کرنے والی اور ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے والی نہ تھی۔ پس یہ اسباب اور مثل ان کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ ان (صحابہؓ) کی کافی توجہ قرآن مجید کے ان الفاظ کی طرف نہیں ہوئی" (ایضاً۔ ص ۱۷)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے :
(۱) انبیاء کرامؑ کے معجزات تورات میں بھی مذکور ہیں۔
(۲) علمائے یہود انھیں معروف معنوں میں معجزات ہی تسلیم کرتے رہے۔
(۳) علمائے یہود میں ان معجزات کی مشہوری کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی ان خوارق عادت واقعات کو تسلیم کر لیا۔
(۴) قرآن مجید کا بیان بھی توریت کے بہت کچھ مشابہ اور مماثل ہے۔ لیکن قرآن میں الفاظ کچھ اس طرح آئے ہیں کہ ان سے دوسرے معنیٰ بھی لیے جا سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خوارق عادت واقعات کو من وعن تسلیم کر لینا غلط تھا تو قرآن نے ایسے گول مول، الفاظ کیوں استعمال کیے کہ یہ غلطی بدستور مسلمانوں میں بھی منتقل ہوتی چلی گئی۔ افکار فاسدہ کی درستی ہی کتاب اللہ کا کام ہے۔ پھر سید صاحب کو علمائے کرام اور صحابہؓ پر یہ بھی افسوس ہے کہ انھوں نے نہ قانون فطرت کا خیال کیا نہ نیچرل سائنس کا، بلکہ خدا کی قدرت کاملہ کا عقیدہ رکھ کر ان کو فی الواقع معجزات ہی تسلیم کر لیا حالانکہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ قرآن کے الفاظ کے دوسرے معنیٰ تلاش کر کے ان واقعات کو مطابق قانونِ فطرت بنا دیتے۔ جیسا کہ آپ نے یہ کوشش فرمائی ہے۔ اور مثال کے طور پر چند معجزات کو مطابقِ قانونِ فطرت کر کے دکھلا بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں :-
"مثلاً ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ طوفانِ نوح کا تمام دنیا میں عام ہونا اور

پانی کا اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہو جانا محالات سے ہے اور خلاف واقع ہے اور اس لیے ان کے خیال میں یہ بات نہ آئی کہ قرآن میں جو الارض کا لفظ ہے۔ اس میں الف لام استغراق کا نہیں ہے بلکہ عہد کا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں کہ انھیں درحقیقت آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کی ولادت میں کوئی نص صریح قرآن میں نہیں ہے کہ وہ فی الحقیقت بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے، نہ ہی حضرت یونسؑ کے قصہ میں ایسی کوئی نص ہے کہ فی الواقعہ ان کو مچھلی نگل گئی اور وہ مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے؟ (تفسیر القرآن۔ دیباچہ ص ۱۷)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) معجزات کے بارے میں جو نصوصِ صریحہ قرآن میں موجود ہیں۔ وہ قطعاً نصوصِ صریحہ نہیں بلکہ محتاجِ تاویل ہیں۔ اور

(۲) اُن کی جو تاویل پیش کی جائے گی وہ بھی قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آپ خود ہی لکھتے ہیں کہ:

اپنے دور کی علمی سطح کی قباحت:

"اور کیا عجب کہ آئندہ زمانہ میں ان علوم کو اور زیادہ ترقی ہو اور جو امور اس وقت محققہ معلوم ہوتے ہیں وہ غلط ثابت ہوتے ہوں۔ اس وقت قرآنِ کریم کے الفاظ کے دوسرے معنی قرار دینے کی ضرورت ہوگی وھلم جرا۔ پس قرآن لوگوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو جائے گا؟ (ایضاً ص ۱۹)

پھر اس کا جواب یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

"پس اگر ہمارے علوم کو آئندہ زمانہ میں ایسی ترقی ہو جائے کہ اس وقت کے امورِ محققہ کی غلطی ثابت ہو تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کریں گے اور اس کو ضرور حقیقت کے مطابق پائیں گے۔ اور ہم کو معلوم ہوگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیے تھے تو وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔ قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا؟ (ایضاً۔ ص ۲۰)

اس جواب سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ جو غلطی سابقہ مفسرین سے ہوئی کہ موجودہ علوم کا لحاظ رکھے بغیر قرآن کی تفسیر کی وہی غلطی آپ بھی کر رہے ہیں۔ کیونکہ آئندہ علوم آپ کی تاویل کو غلط ثابت کر سکتے ہیں۔

۲۔ سابقہ مفسرین کی تفسیر کی تائید تورات، علمائے یہود کی تصانیف اور قرآن کے ظاہری مفہوم سے ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ سرسید کی تاویل سے بدرجہا زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ کیونکہ سید صاحب کی تاویل

کو کسی چیز کی بھی تائید حاصل نہیں۔ مزید یہ کہ اس تاویل کو وہ خود بھی ناقابلِ اعتماد سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تاویل کے ماخذ دورِ جاہلیت کی لغت کے متروک اور غیر مشہور معانی، اور پھر ان سے حسبِ خواہش استنباط ہے۔

پھر معجزات کی ایسی تاویل کے جواز میں آپ ایک مثال بیان کرتے ہیں:

"مثلاً فرض کرو کہ قرآن مجید سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ سورج زمین کے گرد پھرتا ہے جس سے طلوع و غروب ہوتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ سورج ساکن ہے اور زمین سورج کے گرد پھرتی ہے۔ اب ہم قرآن پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سورج کا پھرنا قرآن میں بطورِ حقیقت کے واقع نہیں ہوا بلکہ علیٰ مَا یَشْهَدُهُ النَّاس بیان ہوا ہے۔ اور وہ سچ ہے۔ پس ہم نے جو اس کو بطورِ حقیقت واقع کے سمجھا تھا وہ ہماری غلطی تھی نہ کہ قرآن مجید کی۔" (ایضاً ص ۲۰)

اس مثال میں بھی کئی ایک مغالطے اور الجھاؤ ہیں۔ مثلاً:

(۱) بات انبیاءؑ کے معجزات کی چل رہی ہے اور مثال آپ اجرامِ فلکی سے پیش فرما رہے ہیں۔

(۲) قرآنِ کریم کے الفاظ سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا۔ "سورج اپنی قرارگاہ پر چل رہا ہے"

اور اس سے مراد اس کی محوری گردش بھی ہو سکتی ہے۔ اور اپنے خاندان سمیت کسی بڑے سیارے کے گرد گردش بھی۔ جیسا کہ موجودہ نظریات اس کی تائید کر رہے ہیں۔

(۳) اجرامِ فلکی کی رفتار کی تحقیق انسان کی عقل کا میدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک ان کے متعلق چار نظریات پیش کیے جا چکے ہیں۔ جن کی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مزید یہ کہ آئندہ بھی اس میں تبدیلی کا امکان ہے۔ اس کے برعکس انبیاءؑ کے معجزات گزشتہ دور کے واقعات اور انسان کے دائرہ تحقیق سے خارج ہیں۔ ان کے متعلق دو ہی نظریے ہو سکتے ہیں۔ اقرار یا انکار۔ چنانچہ تمام مذہبی طبقے ان معجزات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ نیچر پرست یا مادہ پرست لوگ ان معجزات سے انکار کر دیتے ہیں:

۵۔ پانچواں نظریہ، نظریہ ارتقاء۔

قرآن کی رو سے آدم کو ایک فردِ واحد، ابوالبشر اور نبی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں اور ابلیس کے الگ اور خارجی وجود کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن نظریۂ ارتقاء کی رو سے آدم نہ تو فردِ واحد قرار دیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بندر کی نسل جو چلی آ رہی تھی اور مابعد انسانوں میں تبدیل ہوئی تو نفخِ روحِ خداوندی کا واقعہ زندگی کے

کس موڑ پر پیش آیا۔ اور کسی معین ہستی میں یہ روحِ خداوندی پھونکی گئی؟ دورانِ ارتقائے نسلِ انسانی فرشتے کہاں سے ٹپک پڑے تھے۔ ابلیس کہاں سے نووارد ہو گیا۔ اور یہ باتیں ایسی تھیں جو قرآن میں مذکور تھیں۔ احادیث میں بھی موجود اور بائیبل سے بھی اُن کی تائید ہوتی تھی۔ ایسی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سید صاحب کی تکنیک یہ تھی کہ:

۱۔ اس سارے واقعہ کے فی الحقیقت کوئی واقعہ ہونے سے ہی انکار کر دیا۔ اور اُسے ایک تمثیلی داستان یا ڈرامہ قرار دیا۔

۲۔ آدم کو فردِ واحد یا نبی قرار دینے کے بجائے اس سے مراد آدمؑ کے بجائے "آدمی" لیا اور کہا، کہ وہ کوئی مخصوص فرد نہ تھا۔ بلکہ بنی نوعِ انسان کا کوئی نمائندہ (REPRISENTIVE OF MAN) تھا۔

۳۔ فرشتوں سے مراد کائناتی قوتیں لیا۔ اور اُن کے سجدہ کرنے سے مراد یہ لی گئی کہ یہ قوتیں انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوئیں۔ گویا انسان اپنے علم و تجربہ سے ان پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ دلیل یہ دی گئی کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا حالانکہ لفظ جمیعاً سے مراد کائناتی قوتیں ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے ذی اجسام بھی ہیں۔

۴۔ (ا) آدمؑ اور اس کی بیوی کے لیے شجرِ ممنوعہ دراصل جنسی ترغیبات تھے۔ یہی شجرۃ الخلد تھا یعنی انسان اپنی اولاد کے ذریعہ بقائے دوام چاہتا تھا۔

نگاہِ بازگشت:

پچھلے ابواب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ اسلامی تاریخ میں جن لوگوں نے سب سے پہلے اصولِ دین میں اختلاف کیا وہ جہمیہ اور معتزلہ تھے۔ یہ دونوں فرقے دوسری صدی کی پیداوار ہیں۔ اور ان دونوں فرقوں کا یہ اختلاف یونانی فلسفہ سے ذہنی شکست خوردگی کی بنا پر تھا۔

۲۔ ان دونوں فرقوں کا اختلاف تین اصولی مسائل میں تھا۔

(ا) دونوں فرقے ذات و صفاتِ باری تعالیٰ میں ارسطو کے ہم نوا تھے۔ جو خدا کو محض ایک تجریدی تصور کے طور پر پیش کرتا ہے۔

(ب) دونوں فرقے وحی کے مقابلہ میں عقل کے تفوق اور برتری کے قائل تھے۔ انھوں نے عقل کی برتری ثابت کرنے کے لیے قرآن سے ایسی جملہ آیات کو یکجا کر کے پیش کر دیا جن میں انسانی عقل کو مخاطب کیا گیا ہے اور اس کا دائرہ کار ہے لیکن وحی کی برتری، حکمت اور اتباع کی آیات کو نظر انداز کر دیا۔

ج ۔ دونوں فرقوں نے تقدیر کے مسئلہ میں مسلمانوں کے مسلمہ عقیدہ سے اختلاف کیا، جو یہ ہے کہ ایمان جبر و اختیار کے بین بین ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں ان دونوں فرقوں کے درمیان بھی اختلاف ہوا۔ جہمیہ انسان کو مجبور محض تصور کرتے تھے اور معتزلہ انسان کو مختارِ مطلق۔

۳۔ اپنے عقائد و نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے اُن کا طریقِ کار یکساں تھا۔ یعنی:

(ا) پہلے متعلقہ احادیث و آثار کو ظنی اور ناقابلِ اعتماد قرار دے کر اُن سے انکار کر دیا جائے۔

(ب) دُوسرا اقدام یہ تھا کہ ثابت شدہ سنت کو بھی سند اور صحت کے مقام سے گرا دیا جائے۔ اور اُس کے لیے عقلی دلائل دیئے جائیں۔

(ج) تیسرا اقدام یہ تھا کہ احادیث و آثار کو پرے ہٹا دینے کے بعد قرآنی آیات کی من مانی تاویل پیش کر دی جائے۔

گویا عجمی تصورات سے مرعوبیت، انکارِ حدیث اور تحریفِ قرآن تینوں باہم آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

۴۔ جو احادیث جہمیہ نے مسئلہ قدر کے معاملہ میں رد کیں۔ وہی احادیث معتزلہ کے نزدیک صحیح ترین تھیں۔ اسی طرح جو احادیث معتزلہ کے نزدیک مردود تھیں وہی احادیث جہمیہ کے نزدیک مقبول ترین تھیں۔ یہی حال ان دونوں فرقوں کی تاویلات قرآنی کا ہے۔ ان حقائق سے یہ نتیجہ لازمی طور پر سامنے آتا ہے کہ جب کوئی انسان یا فرقہ کسی عجمی تصور کا غلام بن جاتا ہے تو قرآن و سنت دونوں کو بازیچۂ اطفال بنا دیتا ہے اور بزعم خویش ایسی قرآنی تاویلات کو قرآنی فکر کا نام دیتا ہے۔

۵۔ ہندوستان میں اس عقلیت پرستی (RATIONALISM) کی نشاۃ ثانیہ سرسید مرحوم سے شروع ہوتی ہے۔ آپ نے اپنے نظریات کے لیے بھی وہی تکنیک استعمال کی جو جہمیہ اور معتزلہ نے کی تھی، یعنی:

(ا) احادیث کو ناقابلِ اعتماد قرار دینے کے بعد قرآن کی ان تمام آیات کی تاویلات پیش کر دیں جن میں انبیائے کرام کے معجزات کا ذکر تھا۔

(ب) نظریۂ ارتقاء پر ایمان نے آپ کو نبوت، وحی، ملائکہ، آدم، ابلیس یا شیطان کے متعلق نئی تاویل و تعبیر پر آمادہ کیا۔ اور ان کے متعلق آپ نے امتِ مسلمہ کے مسلمہ تصورات و عقائد کو یکسر بدل ڈالا۔ جس کی بنا پر امتِ مسلمہ نے بالاتفاق آپ پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔

باب (۵)

عجمی تصوّرات کا تیسرا دور

جمہوری دور کے منکرین حدیث:

سرسید مرحوم کے بعد کچھ ایسے افراد بھی منظرِ عام پر آتے ہیں جنھوں نے مندرجہ بالا افکار و نظریات کی آبیاری کی۔ مولوی چراغ علی مکمل طور پر سرسید کے ہمنوا تھے۔ پھر کچھ حضرات ایسے بھی منظرِ عام پر آئے جن کے سامنے کوئی نیا نظریہ یا ذاتی فکر موجود نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا سارا زور احادیث کو ظنی، ناقابلِ اعتماد اور ناقابلِ صحت قرار دینے پر صرف کر دیا۔ ان میں سے چند قابلِ ذکر ہستیوں کے نام یہ ہیں:

عبداللہ چکڑالوی، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، علامہ مشرقی، حشمت علی لاہوری، مستری محمد رمضان گوجرانوالہ، محبوب شاہ گوجرانوالہ، خدا بخش، خواجہ احمد دین امرتسری، سید عمر شاہ گجراتی اور سید رفیع الدین ملتانی وغیرہ۔ ان لوگوں نے احادیث کا کلیۃً انکار کر دیا اور "حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر اس پر انحصار کیا لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآنِ کریم ارکانِ اسلام کی جزئیات تک بیان کرنے میں ساکت تھا۔ اب احادیث کے بجائے انہیں محض اپنے غور و فکر کا سہارا لینا پڑا۔ پھر ان میں سے بعض نے متواتر اعمال کا سہارا لیا۔ لیکن پھر بھی بات بناتے نہ بن سکی۔ آخر ان سب دوستوں میں شدید اختلافات رُونما ہوئے اور جوت و پیزار بھی ہوئی۔ نتیجۃً ان کے بھی کئی فرقے بن گئے جو صرف ایک نماز کے معاملہ میں ہی کئی طرح کے اختلافات رکھتے تھے اور وُہ اختلافات بھی اصولی قسم کے تھے مثلاً کچھ فرقے صرف دو نمازیں پڑھتے تھے۔ کچھ کہتے تھے کہ قرآن سے تین نمازوں کا ثبوت ملتا ہے، لہٰذا وُہ تین نمازیں پڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ ہر رکعت میں دو سجدے کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو ایک ہی سجدہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ نماز میں یہ لوگ صرف قرآنی آیات ہی پڑھتے ہیں خواہ قیام یا رکوع، سجدہ ہو یا جلسہ۔ پھر کچھ ایسے ہیں جو سلام پھیرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے، اتنے اختلافات تو صرف نمازیں ہوتے، باقی احکام میں جس قدر اختلافات ہو سکتے ہیں اس کا آپ خود اندازہ فرما لیجئے۔

چند مشہور منکرین حدیث کا مختصر تعارف

۱۔ عبداللہ چکڑالوی آپ ضلع گورداسپور کے موضع چکڑالہ میں پیدا ہوئے اور اس نسبت سے چکڑالوی کہلاتے ہیں۔ آپ ایک الگ فرقہ مسمٰی "اہل القرآن" کے بانی ہیں۔ آپ کا تبلیغی مرکز لاہور تھا۔ آپ پہلے اہلحدیث اور متبع سنت تھے۔ بعد میں حجیت حدیث سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ اسے شرک فی الکتاب قرار دینے لگے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول یا فعل کو دین اسلام میں مانا جائے خواہ فرضاً جملہ رسل وانبیاء کا قول یا فعل ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح شرک موجب عذاب ہے اسی طرح مطابق إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ اور أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ اور لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا کے شرک فی الحکم یعنی دین میں اللہ کے حکم کے سوا اور کا حکم ماننا بھی اعمال کا باطل کرنے والا باعث ابدی ودائمی عذاب ہے۔ افسوس شرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں۔"

(ترجمۃ القرآن ص ۹۵)

اب دیکھئے کسی انسان کے ذہن میں جب ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے تو وہ کسی معاملہ کے صرف ایک پہلو پر ہی دلائل تلاش کرنے لگتا ہے اور باقی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے، پھر اسے ایسی آیات بھی نظر نہیں آتیں جن میں دوسرے پہلوؤں کے متعلق احکامات دیئے گئے ہوتے ہیں۔ چکڑالوی صاحب کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ آپ نے جو تین آیات کا حوالہ دیا ہے ان سب کا مفہوم یہ ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔ اب اگر اللہ ہی بیسیوں مرتبہ اپنی کتاب میں اپنے رسول کی اطاعت واتباع کا حکم دے تو یہ شرک فی الحکم یا شرک فی الکتاب کیسے بن گیا۔ انکارِ حدیث کی بنا پر آپ دوسرے منکرین حدیث کی طرح معجزات، شفاعت، عذاب قبر، ایصال ثواب اور تعدد ازدواج وغیرہ کے بھی قائل نہ تھے۔ تعدد ازدواج کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ:

"تعدد ازدواج بحوالہ قرآن زنا میں داخل ہے۔ جس سے انبیاء ورسل سلام علیہم اور ان کی امت پاک ہے۔ اور ان پر سراسر افتراء اور بہتان ہے" (اشاعۃ القرآن مئی ۱۹۲۲ء ص ۱۰)

یہ ہے موصوف کی دماغی ٹیڑھ اور قرآن دانی کا نمونہ۔ قرآن میں بار بار يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ اور يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ کے الفاظ جمع کے صیغہ کے ساتھ آئے ہیں۔ جو ان کو نظر نہیں آتے۔ اور بڑی دیدہ دلیری سے "بحوالہ قرآن" یہ بھی ارشاد فرما دیا۔ پھر سراسر افتراء

بہتان کے مرتکب آپ ہیں یا دوسرے مسلمان؟ پھر چکڑالوی صاحب کی یہ عبارت بھی قابل داد ہے کہ اکیلے رسول اللہ کو ہی نہیں بلکہ ایسے تمام انبیاء و رسل اور امت کے افراد کو زنا کا مرتکب قرار دے دیا۔ جن کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔

البتہ ایک بات ایسی ہے جس میں چکڑالوی صاحب دوسرے منکرین حدیث سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ آپ رسول اللہ کے سید الانبیاء ہونے کے بھی قائل نہ تھے۔ آپ ایک سائل کو جواب یا فتویٰ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"آپ نے اپنے مسئلہ قرآن اور بخاری اور صحاح ستہ کے خلاف رسول اللہ کو نبیوں کا سردار لکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں متبع اور مقتدی کل انبیاء کا عموماً اور ابراہیم کا خصوصاً لقب مرحمت فرمایا ہے۔" .... اور پھر آپ نے ان کو نبیوں کا سردار جا کر دوسرے انبیاء و رسل کی تحقیر و تذلیل کر کے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ کا کفر کیا یا نہیں؟" (حوالہ رسالہ ایضاً ص۱۱۲)

اب دیکھئے:۔

۱۔ چکڑالوی صاحب کو لَا نُفَرِّقُ والی آیت تو قرآن میں نظر آ گئی مگر تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کہیں نظر نہیں آیا۔ پہلی آیت میں مقام رسالت کا ذکر ہے۔ جو سب کا برابر ہے۔ دوسری آیت میں ان کے درجات کا بیان ہے۔ جن میں تفاوت ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سابقہ انبیاء کی اتباع کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ ان کی ہدایت کی اقتدار کا حکم دیا ہے۔ اور یہ ہدایت منزل من اللہ اور سب انبیاء پر ایک جیسی ہی نازل ہوتی ہے اور ابراہیم کی ملت کی اتباع کا ذکر فرمایا ہے۔ اور ملت سے مراد وہ نظام دین ہے۔ جو ابراہیمؑ نے قائم فرمایا تھا۔ نظام دین کے قیام میں پیش آمدہ مشکلات میں اگر سابقہ انبیاء کی ایسی ہی مشکلات اور صبر و ثبات کا حوالہ دے کر آپ کو بھی ان کے طریق کار کی اتباع کی ہدایت کی گئی ہے۔ تو اس سے آپ کا درجہ کم کیسے ہو گیا؟ درجہ کی فضیلت تو یوں معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس نظام دین کو قائم کرنے میں کون سا رسول سب سے زیادہ کامیاب رہا ہے؟ اور قرآن، حدیث اور تاریخ شاہد ہے۔ کہ اس پہلو سے آپ سب سے بلند درجہ پر ہیں۔

۳۔ پھر آپ کو بخاری اور صحاح ستہ میں یہ حدیث "اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ" بھی کہیں نظر نہ آئی۔ اس حدیث کی رو سے آپ تمام بنی نوع انسان کے سردار ہیں۔ جن میں تمام انبیاء و رسل بھی شامل ہیں۔ نہ ہی آپ کو کہیں یہ حدیث نظر آئی کہ اگر آج موسیٰؑ زندہ ہوتے۔ تو انہیں میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔" اگر آپ ان حدیث کے قائل نہیں تو حوالہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟

کتاب وسنت لازم و ملزوم ہیں۔ اب اگر کوئی شخص سنت سے انکار کرتا ہے تو اس کی یہ فکر لازمی طور پر بھی انکارِ قرآن پر منتج ہوتی ہے۔ وہ بعض آیات تو پیش کرتے ہیں مگر بعض کو سرے سے نظر انداز ہی کر جاتے ہیں اور یہی انکارِ قرآن ہے۔

انکارِ حدیث کے بعد چکڑالوی صاحب قرآن کی جزئیات کی تعیین میں نہایت بے بس ثابت ہوئے۔ نماز کی ادائیگی سے متعلق آپ کا طریق کار یہ تھا کہ صرف قیام ہی فرمایا کرتے تھے اور چند قرآنی آیات پڑھ کر ختم کر دیتے تھے۔ جیسا کہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ نماز سے متعلقہ رکوع اور سجدہ والی آیات یا تو آپ کو نظر نہیں آئی تھیں۔ یا ان پر عمل کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے۔

۲۔ نیاز فتحپوری (۱۸۸۷ء — ۱۹۶۶ء) فتح پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد مختلف رسائل میں بطور ایڈیٹر کام کیا۔ پھر لکھنؤ سے اپنا رسالہ نگار نکالا۔ آپ نے ٹیگور کی کتاب گیت بخلی کا اردو ترجمہ کیا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ پر فلسفہ کا رنگ بہت زیادہ غالب آگیا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ منکرِ حدیث ہی نہیں، بلکہ منکرِ قرآن اور منکرِ اسلام بھی ہو گئے تھے۔ آپ کی کتاب "من و یزدان" آپ کے عقائد و نظریات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

تمام منکرینِ حدیث میں آپ کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپ قرآن کو نہ خدا کا کلام سمجھتے ہیں اور نہ منزل من اللہ۔ بلکہ اسے ایک انسان کا کلام سمجھتے ہیں۔ اب "من و یزدان" کے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"عام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ قرآن اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے بہ تمامہٖ پہلے لوح محفوظ میں منقوش و موجود تھا۔ اور فرشتہ (جبرئیل) یہی محفوظ و منقوش کلام رسول اللہ کو آکر سناتا تھا۔ اور رسول اللہ انہی آسمانی الفاظ کو دہرا دیتے تھے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی بلکہ کوئی نئی زبان ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جا سکتا تھا۔ لیکن جبکہ وہ اسی زبان میں نازل ہوئی جو عام طور پر عرب میں رائج تھی تو اس کے الفاظ کو کیونکر خدائی الفاظ کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کا بتایا ہوا ہے اور خود رسول کے عقل و دماغ کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خدا کو اس کے منصب سے گرا کر انسان کی حد تک کھینچ لانا ہے اور رسول کو سطحِ انسانیت سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔" (من و یزدان حصہ اول ص۵۵)

اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ایک عربی رسول اور عربی امت پر نازل ہوتا۔ تو ایسے قرآن کا فائدہ کیا تھا۔ جسے نہ نبی سمجھتا، نہ کوئی دوسرا اسے

سمجھ سکتا؟ اور یہ کتاب کتابِ ہدایت کیسے قرار دی جا سکتی تھی؟ لیکن یہی وجہ نیاز صاحب کے نزدیک خدا کو انسان کے مقام پر اور رسول کو انسان سے بھی کسی کم تر مقام پر لانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ وہ کھل کر اپنے فکر کا اظہار یوں فرماتے ہیں، کہ:۔

"کلام مجید کو نہ میں کلامِ خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہامِ ربانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں اور اس مسئلہ پر میں اس سے قبل کئی بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں۔"
(حوالہ ایضاً ص۵۴)

گویا قرآن کو انسان کا کلام سمجھنا ہی دراصل رسول اللہ کو انسانیت کے مقام پر اور خدا کو خدائی کے مقام پر سمجھنے کے مترادف ہے۔

یہ تو تھی آپ کے ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالکتاب کی مثال۔ اب باقی اسلامی عقائد پر بھی آپ کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"ہرچند خدا کے اس جدید تصور (جو نیاز صاحب کی اختراع ہے۔مؤلف) سے انبیاءؑ و رسل، مصحفِ مقدسہ، حیات بعد الموت، دوزخ و جنت، ملائکہ و شیاطین، حشر و نشر عذاب و ثواب ختم ہو جائیں گے۔ یا ان کی کوئی توجیہہ کرنا ہو گی۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں ہم کو ان مروجہ عقائد اور خدا، دونوں میں سے ایک کو لینا ہے۔ اور غالباً یہ زیادہ آسان ہو گا کہ خدا کے مقابلہ میں معتقدات کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔" (حوالہ ایضاً ص۴۹)

یہ تو تھا اسلامی عقائد سے آپ کی بیزاری کا اعلان۔ اب خدا کے متعلق آپ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے:۔

"خدا کو آگ برساتے ہوئے، خون اور پیپ پلاتے ہوئے، آتشیں کوڑوں سے سزا دیتے ہوئے بہت زمانہ ہو چکا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ وہ صرف زخموں پر مرہم رکھے اور بجائے کسی خاص قوم پر لطف کرنے کے وہ تمام بنی نوعِ انسان کو اپنا ہی بندہ سمجھے، اور نجات کا دروازہ سب کے لیے بغیر کسی شرط کے کھول دے۔ لیکن مشکل یہ ہے، کہ جب تک مذاہب کا عقائدی اختلاف دور نہ ہو۔ خدا کا کوئی ایسا کائناتی تصور قائم ہی نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی شخص اختلافِ عقائد کو مہمل قرار دیتا ہے، تو اسے ملحد و کافر قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے میری رائے میں خدا کی خدائی اگر صحیح معنی میں قائم ہو سکتی ہے، تو اس کی توقع ہم کو صرف کافروں اور ملحدوں ہی سے کرنا چاہیے۔" (حوالہ ایضاً ص۵۳۸)

سو یہ ہیں نیاز فتحپوری صاحب، جو خدا کو بھی ہدایات جاری فرما سکتے ہیں۔ علماء نے وقت نے جب آپ کی یہ اسلام بیزاری اور کافروں اور ملحدوں میں شامل ہونے کی آرزو دیکھی

تو آپ پر کفر و الحاد کا فتویٰ لگا دیا۔ اور آپ کو موقع دے دیا۔ کہ آپ اپنے اختراعی خدائی خدائی قائم کرنے میں ممد ثابت ہوں۔ جب آپ کفر و الحاد کا فتویٰ لگا یا گیا تو آپ نے فرمایا۔

" یہ تھا وہ سب سے پہلا فتویٰ کفر و الحاد جس نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اگر مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے تو میں یقیناً کافر ہوں اور اگر میں مسلمان ہوں تو یہ سب نامسلمان ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کورانہ تقلید کا اور تقلید بھی رسول و احکام کی نہیں۔ بلکہ بخاری و مسلم و مالک وغیرہ کی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی کیفیت اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک ہر شخص اپنی جگہ غور کر کے کسی نتیجہ پر نہ پہنچے " (ایضاً ص۵۲)

نیاز صاحب کے درج بالا بیان سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ انکار حدیث کے ساتھ ہی انکار قرآن کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر پورے طور پر انکار قرآن اور اس کے بعد انسان گمراہی کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔

۲۔ کوئی مسلمان کتنا ہی ملحد زندیق ہو جائے وہ خود کو ہی صحیح مسلمان اور دوسرے تمام مسلمانوں کو غلط یا نامسلمان سمجھتا ہے۔

۳۔ اسلام کے نام میں کچھ ایسی کشش ہے کہ ملحد اور دہریہ ہونے کے باوجود کوئی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس کے تمام عقائد و نظریات کو پامال کرنے کے بعد بھی اسلام سے وابستہ رہنا پسند کرتا ہے۔

۳۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۶۴ء) آپ تعلیم سے فراغت کے بعد اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل بنے۔ انشاء پرداز، فلسفی اور مورخ تھے۔ تذکرہ۔ قول فیصل۔ مولوی کا غلط مذہب اور اشارات آپ کی تصانیف ہیں۔ آپ نے ۱۹۳۱ء میں خاکسار تحریک کی بنا ڈالی، اور ایک ہفتہ وار پرچہ الاصلاح جاری کیا۔ ۱۹۴۰ء میں یہ تحریک خلاف قانون قرار دی گئی اور دم توڑ گئی۔ آپ اچھرہ میں مدفون ہوئے۔

آپ نیاز فتح پوری کے ہم پلہ فلسفی تو نہ تھے۔ تاہم ان سے آدھے ضرور تھے۔ حدیث اور فقہ سے انکار کے بعد عقل نے آپ کو جس مقام پر پہنچایا۔ اس کا نقشہ کچھ اس طرح پیش فرماتے ہیں:

" تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس عام میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ کونسا مذہب سچا ہے؟ کونسا شارع کائنات۔ اللہ تعالیٰ کے منشا کے عین مطابق ہے؟ مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے؟ نہیں بلکہ خود مذہب کیا شے ہے؟ اور اس کا مقصود بالذات لعینہٖ کیا ہے؟ خود خدا کی ہستی اور اس کے صحیح منشا کے

متعلق آج تک کوئی حتمی اور متفق علیہ دلیل نہیں مل سکی "۔ (دو جا پہ تذکرہ ص ۔۔۔)

اب دیکھیے علامہ صاحب خدا کی ہستی کے متعلق کوئی ایسی حتمی اور متفق علیہ دلیل چاہتے ہیں۔ جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ہم عرض کریں گے۔ کہ ایسی حتمی اور قطعی دلیل موجود ہوتی تو کسی بھی شخص کا کافر یا دہریہ ہونا ناممکن ہوتا۔ پھر خدا کی اطاعت۔ اضطراری ہوتی اختیاری نہ ہوتی۔ جیسے کہ دوسری تمام اشیائے کائنات ماسوائے جن و انسان اللہ کی عبادت میں مصروف ہیں۔ لیکن انسان کو اختیار اور عقل ممیزہ بھی عطا کی گئی ہے۔ اور یہ بات انسان کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے۔ کہ وہ خدا کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ بذریعہ وحی اس کی عقل کی رہنمائی اس انداز میں ضرور کی گئی ہے۔ کہ وہ اشیائے کائنات میں غور و تدبر کے بعد خدا کی ذات پر یقین کرے۔ اور اگر وہ انسان اتنا عقلمند نہیں تو پھر بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان بالغیب رکھے۔

اب اگر علامہ صاحب خدا کی ہستی کے متعلق ہی متردد ہوں تو انہیں کسی بھی رسول یا مذہب یا کسی مذہب کی سچائی ڈھونڈنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ آپ کی اس فلسفیانہ فکر نے آپ کو صرف حدیث سے ہی نہیں بلکہ مذہب اور خدا سے بے نیاز کر دیا۔ لیکن وہی اسلام سے وابستگی آڑے آتی رہی۔ اور قرآن سامنے رہا۔ قرآن میں آپ کو مغربی اقوام ہی صحیح مومن نظر آنے لگیں۔ انگریز قوم اور انگریزی تہذیب کی جو عقیدت آپ کے دل میں تھی اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

"یہی انگریز تو وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرشتوں نے اپنے پروردگار سے جب وہ زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا، یہ کہا تھا کہ: "کیا تو ایسے شخص کو خلیفہ بناتا ہے جو اس زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا، اور ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم تیری حمد و ثنا۔ کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں" تو اللہ میاں نے ان انگریزوں کے آئندہ اعمال پر غور کرتے ہوئے فرشتوں کو جواب دیا تھا کہ "میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" پھر اللہ میاں نے ان انگریزوں کو بہت سی چیزوں کے نام اور بہت سی چیزوں کی حقیقتیں دکھا دیں اور پھر ان چیزوں کے استعمال پر قدرت دی اور اللہ کے فرشتے سلام علیکم خوش رہو اس زمین پر اور اچھی زندگی بسر کرو تم[1]! کہتے ہوئے ہر دروازے

---

[1] یہ سورۃ زمر (۔۔) کی ایک آیت کا ترجمہ ہے کہ جب قیامت کو لوگوں کا حساب کتاب ہو چکے گا تو متقین کو قافلہ کی صورت میں جنت کی طرف لے جایا جائیگا تو فرشتے ان سے کہیں گے کہ "تم پر سلامتی ہو اور تم خوش رہو۔ جنت کے دروازوں سے ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جاؤ۔

سے داخل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تم انگریز نبل کو راحت و آرام دے۔ آپ بلد مرہو تم قیامت تک"۔ (تذکرہ ص۲۷۔ عربی ایڈیشن)

تاہم آپ نے بعد میں یہ اقرار کر لیا تھا کہ میں پیٹ کی خاطر قرآن کی تکذیب کرتا رہا ہوں وہ تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے نفس کے لیے شب و روز ظلم کرتا رہتا ہوں۔ اور صبح و شام اپنی تنخواہ کے لیے انگریز کی پرستش کرتا رہا ہوں اور اپنے رب کی عبادت نہیں کرتا۔ تاکہ وہ مجھے اپنی طرف سے روزی عطا فرمائے۔ اور میں دن بدن قرآن کی تکذیب کرتا رہتا ہوں اور میں توحید پر مداومت کی طاقت نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنے نفس کے لیے مکر پر مکر کیے جاتا ہوں اور بڑی سرعت سے بار بار شرک میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ سو تم مجھے نہ دیکھو۔ بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے دیکھو"۔ (تذکرہ ص۱۴۲ عربی ایڈیشن)

۴۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق بسال ضلع کیمبلپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب سے منسلک رہے اور کیمبلپور کے کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ آپ کی تصانیف، ایک اسلام، دو اسلام، دو قرآن، حرف محرمانہ اور تاریخ حدیث ہیں۔ آپ بھی علامہ مشرقی کی طرح اقوام مغرب اور مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے حدیث کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ملّا سے میرا نزاع اس بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر کو جزو اسلام بنانا چاہتا ہے اور میں قرآن کو پیش کر کے ملت کو ان ملائی قیود سے آزاد کرانا چاہتا ہوں" (دو اسلام ص۱۱۴)

انکار حدیث کے بعد فکر قرآنی نے آپ کو جس مقام پر پہنچایا اس کا ماحصل یہ ہے۔

۱۔ رسولوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے آمنوا باللہ والیوم الآخر کو قبول اعمال کی بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ اس میں ایمان بالرسول شامل نہیں" (ایک اسلام ص۴۸)

۲۔ حتیٰ کہ رسول اکرم پر بھی ایمان لانا ضروری نہیں۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اللہ تعالیٰ آیت وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا میں نیک یہود و نصاریٰ کو مژدہ رحمت سنا رہا ہے۔ یہ لوگ خدا و آخرت پر تو یقین رکھتے تھے، مگر ہمارے رسول کی رسالت کے قائل نہ تھے۔ ممکن ہے ملّا میری اس تحریر سے بھڑک اٹھے کہ لو جی یہ زندیق و ملحد نجات کے لیے ایمان بر محمدؐ کو بھی ضروری نہیں سمجھتا"۔ (ایک اسلام ص۶۶)

۳۔ اب اس فکر برق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ "دوسری اقوام کے انبیاء سب رسول اللہؐ کے ہم مرتبہ ہیں، مثلاً موسیٰ و عیسیٰ، ابراہیم و محمد، رام و کرشن، کنفیوشس، زرتشت وغیرہ علیہم السلام"۔ (ایک اسلام ص۲۵)

۴۔ آپ نے پہلے تو ایمان بر محمدؐ کو بھی غیر ضروری قرار دیا تھا۔ اب تمام انبیاء کو ضروری

قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"دوسری اقوام کے انبیاء پر ایمان لانا ان کے اسوہ ہائے حسنہ پر چلنا۔ ان کے مناقب بیان کرنا، انہیں ہر لحاظ سے محمدؐ کا ہم مرتبہ ثابت کرنا اور ان کی تعلیمات کو تعلیماتِ قرآن کہنا ہمارا کام تھا لیکن اسے کر رہے ہیں بعض غیر مسلم" (ایک اسلام ص۲۷۵)

کچھ پتہ یہ ہے یہ بعض غیر مسلم جو ہمارے کرنے کے کام کر رہے ہیں۔ وہ کون ہیں؟ وہ ہیں اقوام مغرب۔ آپ بھی علامہ مشرقی کی طرح اقوام مغرب پر اور ان کی تہذیب پر بدل و جان نثار تھے انگریز قوم کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"یہاں آپ کی آنکھوں کے سامنے اللہ کے تمام انعامات سے (انگریز) لطف اندوز ہو رہے ہیں، سلطنت اس کی، علم اس کا، فضائیں اس کی، ہوائیں اس کی، باغ اس کے، نہریں اس کی، دانش اس کی حکمت اس کی، اگر کل کو اللہ اس کی آخرت بھی سنوار دے، تو آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں"

(ایک اسلام ص۱۳۳)

۵۔ آپ اسی قوم انگریز کو ہی متقین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"متقین کا مصدر ہے تقویٰ جس کے معنی ہیں حفاظت بچاؤ، ڈیفنس۔ یعنی متقی لوگ وہ ہیں جن کا ڈیفنس مضبوط ہو، جن کی سرحدیں مستحکم ہوں، جو مہیب عسکری طاقت کے مالک ہوں اور جن کا کردار اتنا بلند ہو کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا جا سکے" (دو اسلام ص۲۶۲)

برق صاحب نے بھی (پرویز صاحب کی طرح) چند در چند کتب لکھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کی وجہ یہی حدیثی اسلام ہے اور جب تک مسلمان اس سے پیچھا نہیں چھڑائیں گے ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تبدریج آپ اس حدیثی اسلام کی طرف خود بھی مائل ہونے لگے۔ چنانچہ دو اسلام میں ایک باب "صحیح احادیث کو ماننا پڑے گا" بھی لکھا بعد میں انکار حدیث کے نظریہ سے توبہ کر لی۔ اور علامہ مشرقی کی طرح اپنی غلطی کا صرف برملا اعتراف ہی نہیں کیا۔ بلکہ "تاریخ حدیث" لکھ کر تلافی مافات بھی کر دی۔

۵۔ اسلم صاحب جے راج پوری

۱۲۹۹ھ میں جیراج پور ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں لیکچرار لگ گئے۔ بعد میں جامعہ ملیہ دہلی میں تاریخ اسلام کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ کی قابلِ ذکر تصانیف، تاریخ القرآن، تاریخ امت (آٹھ جلدوں میں) اور الوراثت فی الاسلام ہیں۔ منکرین حدیث میں بعض وجوہ سے آپ کا مقام بلند ہے۔ پرویز صاحب نے انہیں کے فکر قرآنی سے فیض حاصل کیا ہے۔ آپ کی نظر میں حدیث کی اہمیت تاریخ سے کچھ

زیادہ نہیں۔ بالفاظ دیگر کوئی شخص بھی موجودہ مجموعہ احادیث میں سے اگر کوئی حدیث قبول کرنا چاہے تو وہ محض اس کی پسند اور مرضی پر منحصر ہے۔ اور اگر رد کر دیتا ہے تو بھی چنداں مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حافظ اسلم صاحب "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" کی تفسیر لکھتے ہوئے احادیث پر ان الفاظ میں تبصرہ فرماتے ہیں:

حافظ اسلم صاحب کا نظریۂ حدیث:

"اس تکمیل کے بعد باب دین میں کمی کیا رہ گئی جو روایتوں سے پوری کی جائے؟ اس لیے روایتوں کی جگہ اپنی تاریخ کی الماری ہے۔ ان سے تاریخی اور علمی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں اور فقہ اسلامی یعنی قوانین و ضوابط کے استنباط میں کام لیا جا سکتا ہے۔ حدیثوں میں آن حضرت ﷺ کے اقوال، اعمال اور احوال بیان کیے گئے ہیں اور اسی کا نام تاریخ ہے۔ بیشک قرآن کے احکام مثلاً نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ پر رسول اللہ نے جو عمل کر کے دکھایا اور امت کو سکھایا اور جو سلسلہ بہ سلسلہ متواتر چلا آ رہا ہے، وہ یقینی اور دینی ہے۔ کیونکہ تواتر یقینیات کے اقسام میں داخل ہے۔ اور اسی کے متعلق قرآن نے کہا ہے: وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔" (طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۵۵ء)

اس تبصرہ پر جناب غلام احمد پرویز صاحب فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ "تواتر بھی وہی یقینی ہے جو قرآن کے مطابق ہو"۔[1]

انکارِ حدیث کے بعد علامہ مشرقی اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق تو انگریز قوم کے دلدادہ بن گئے تھے۔ مگر آپ ان کے برعکس روس نوازی اختیار فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں سوویت روس میں اہل مذاہب اور مسلمانوں پہ مظالم ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ قرآنی زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ عالم میں جو کچھ حرب و ضرب، شورش و انقلاب، تغیر و تبدل ہو رہا ہے وہ سب تکمیل دین اور اتمام نور کے لیے ہو رہا ہے۔ اور اسلام کے واسطے زمین تیار کی جا رہی ہے۔ کیونکہ انسانیت کو ایک نہ ایک دن ان حقائق ثابتہ پر پہنچنا لازمی ہے۔" (نوادرات ص۱۱۳)

پھر فرمایا:۔

"جملہ مذاہب (نہ کہ دین) اشخاص پرستی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ

---

[1] ور قرآن وہ ہے جو پرویز صاحب نے سمجھا یعنی تواتر بھی وہی یقینی ہے جو آنجناب کی قرآنی بصیرت کے مطابق ہو۔

میں سوائے تفرقہ اندازی، سفک دم اور عداوت پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں۔ اس کا مٹانا اسلام کا فریضہ ہے اور یہی روسیوں نے کیا ہے۔ یہی نفی لَا ہے۔" (ایضاً ص۱۱۵)

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقائق ثابتہ جو قرآن میں مذکور ہیں، رسول اللہؐ کو معلوم تھے یا نہیں؟ اگر معلوم تھے تو کیا انہوں نے اسی طرح دوسرے مذاہب پر مظالم ڈھا کر اسلام کے لیے زمین ہموار کی جس طرح موجودہ دور میں روس میں ہو رہا ہے؟ اور نفی لَا کا آپؐ نے اور صحابہ نے یہی مطلب سمجھا تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

آپ کے روس نوازی کے قرآنی فکر کی بنیاد پر آگے چل کر پرویز صاحب نے "قرآنی نظام ربوبیت" ایجاد فرمایا۔ اور تمام منکرین حدیث پر آپ کا احسان یہ ہے کہ آپ نے "مرکز ملت کا تصور" اختراع کر کے ان حضرات کو ایک بہت بڑی پریشانی سے نجات دلائی۔ آپ کے مزید عقاید و نظریات کی تفصیل اس کتاب میں مل جائے گی۔ بالخصوص اس کتاب کا حصہ "دوام حدیث" میں آپ ہی کے ارشادات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر آپ نے بعض ایسے مسائل کا بھی انکار کیا، جن کے اشارات قرآن کریم میں ملتے تھے۔ مگر ان کی وضاحت احادیث میں مذکور تھی اور وہ متفقہ طور پر پہلے سے ہی تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان میں کچھ مسائل ایسے بھی تھے جن کی داغ بیل سر سید احمد خاں ڈال چکے تھے، مثلاً حج کے موقعہ پر کھانے پینے کی ضرورت سے زیادہ قربانی آپ کے خیال میں ایک لغو فعل تھا۔ سید صاحب تعدد ازواج کے بھی قائل نہیں تھے، وہ قرآن کریم میں کسی طرح کے نسخ کے بھی قائل نہ تھے، وہ بینکوں کے سود اور تجارتی سُود کو جائز قرار دیتے تھے۔ (اس مسئلہ میں ادارہ طلوع اسلام سید صاحب سے اختلاف رکھتا ہے) نیز وہ وصیت کے لیے کسی شرط کے بھی قائل نہ تھے۔ حافظ اسلم صاحب نے ان مسائل کو شرح و بسط سے پیش کیا اور کچھ مزید مسائل کا اضافہ بھی کیا مثلاً عذاب قبر سے انکار اور اطاعت والدین کی نفی وغیرہ وغیرہ۔

تیسرے دور کا آغاز

گو سر سید احمد خاں سے لے کر آج تک کی قرآنی فکر کی تحریک میں ایک تاریخی تسلسل موجود ہے۔ تاہم اس دور کا آغاز ہم قیام پاکستان سے کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس دور میں چند نئے نظریات بھی فکر قرآنی میں شامل ہو گئے۔ جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

غلام احمد پرویز | آپ حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کے فیض یافتہ ہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گزارا۔ آپ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں سیکشن آفیسر کے طور پر خدمات سرانجام

دیتے رہے۔ آپ علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ موصوف نے وفات پائی تو ان کی یادگار کے طور پر سید نذیر نیازی صاحب نے ایک ماہنامہ بنام طلوع اسلام جاری کیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد پرویز صاحب نے اس ماہنامے کی سرپرستی سنبھال لی۔ اور تعلیمات اقبال کے علاوہ آہستہ آہستہ اس پرچہ کو اپنے افکار و نظریات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنا لیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا تو آپ دہلی سے کراچی منتقل ہوئے۔ کراچی آکر آپ نے اس ماہنامہ کو اب محض اپنے افکار کی اشاعت کے لیے مختص کر لیا۔ اس ماہنامہ کا جلد نمبر بھی ۱۹۴۷ سے ہی شروع کیا گیا۔ اب یہ پرچہ پرویز صاحب، ان کی پارٹی اور دوسرے منکرین حدیث کا ترجمان بن کر سامنے آیا۔ ۱۹۵۸ء میں قبل از وقت پنشن ملی۔ بعدہٗ اس پرچہ سمیت لاہور گلبرگ کوٹھی نمبر 25/B میں منتقل ہو گئے اور اسی مقام پر فروری ۱۹۸۵ء میں ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ مغربی مفکرین کے افکار و نظریات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اپنے مافی الضمیر کی تشریح کے لیے بکثرت ان کے اقتباس پیش کرتے جاتے ہیں۔ بعد میں قرآنی آیات لکھ کر ان افکار پر فٹ کر دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے افکار و نظریات کی مکمل وضاحت کے لیے طلوع اسلام کو ادارہ کی شکل دی جس کے مدیر آپ خود ہیں۔ اس ادارہ نے آپ کی بہت سی تصانیف کو شائع کیا ہے۔ جن میں سے اکثر کا ذکر آپ کو اس کتاب میں مل جائے گا۔

طلوعِ اسلام کا اپنے پیشرووں کو خراجِ عقیدت

ادارہ طلوعِ اسلام کے پیشرو یا سلف صالحین میں سے اکثر کا ذکر اس سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز مدیر ادارہ مذکور ان حضرات کے افکار و نظریات سے، ماسوائے چند فروعی اختلافات کے، پوری طرح متفق ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کن الفاظ میں ان حضرات کو خراج عقیدت پیش فرما رہے ہیں۔

معتزلین اور طلوعِ اسلام:

"اگر مسلک اعتزال باقی رہتا تو یہ جمود و تعطل جو آج مسلمانوں میں نظر آ رہا ہے وجود میں نہ آتا اور علم و فکر کی دنیا میں مسلمان آج ایسے مقام پر کھڑے ہوتے جہاں ان کا کوئی مقابل نہ ہوتا۔"

(طلوعِ اسلام ۳۰ جولائی ۱۹۵۵ء)

گویا مسلمانوں کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ انہوں نے مسلکِ اعتزال کو ترک کر دیا ہے۔

سر سید احمد خاں اور طلوعِ اسلام:

اور سر سید کے کارناموں سے ادارہ طلوعِ اسلام اتنا متاثر ہے کہ اس کی مدح و تحسین کے دوران ملازمت آپ کے مضامین "رازی" اور ایک مسلمان کے نام سے چھپتے رہے۔

میں "پاکستان کے معمارِ اول" کے نام سے کتاب بھی شائع کی ہے۔ اسی کتاب کے مؤلف ص ،، پر یوں رقمطراز ہیں:

"سرسید نے صدیوں کے جمود کی سلوں کو توڑا اور آنے والوں کے لیے فکر و تدبر کا راستہ صاف کیا۔ اس کا یہ کارنامہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے بعد آنے والے قرآنی فکر میں کتنا ہی کیوں نہ آگے بڑھ جائیں۔ اس سابق اول کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"ہم سرسید کے اس احسانِ عظیم سے سبکدوش نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے انتہائی تاریکیوں میں اس مبارک و مسعود کام کا آغاز کیا ہے۔ سرسید کی روح آج مفکرینِ اسلام کی تازہ بہ تازہ کاوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وجد و مسرت سے جھوم جھوم کر کہہ رہی ہے، دیدۂ آغازم، انجام نگر"..... "ہمارا دور سرسید کے دور سے علمی اور فکری لحاظ سے بہت آگے ہے اور اسی لیے جن مفکرین نے اس زمانے میں اپنے تدبر فی القرآن کے نتائج پیش کیے ہیں وہ سرسید کے فکری نتائج کے مقابلہ میں کہیں بلند اور محکم دکھائی دیتے ہیں لیکن اس سے سرسید کی فکری عظمت کم نہیں ہو جاتی، بہر حال سابقِ اول، اول ہی ہوتا ہے۔" (پاکستان کا معمارِ اول ص ۷۵، ۷۶)

علامہ مشرقی اور ادارہ طلوعِ اسلام:

"علامہ صاحب مرحوم و مغفور کی عالمی شہرت کا آغاز ایک ریاضی دان کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک عظیم فوجی تحریک کے بانی اور قائد کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے۔ یہ سب کچھ ان کی عظمت کی شہادت دے رہا ہے۔ لیکن "تذکرہ" کے مصنف کی حیثیت سے وہ جس اعزاز کے مستحق تھے وہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ عصرِ حاضرہ کے علوم کی روشنی میں قرآنی حقائق کو پیش کرنے کی یہ بڑی کامیاب کوشش تھی۔" (طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۶۳ء)

حافظ اسلم صاحب اور ادارہ طلوعِ اسلام:

"آج اسی سرزمین میں علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کی قرآنی فکر برگ و بار لا رہی ہے جنہوں نے اپنی عمرِ عزیز اسی جہاد کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے تاکہ ہم ان کے تدبر فی القرآن کے نتائج سے مستفیض

ہو سکیں میرے کاشانۂ فکر میں سلیم! اگر کوئی چمکتی ہوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو وُہ انہیں کے جلائے ہوں دیوں کا فروغ ہے۔" (سلیم کے نام سترھواں خط ص ۳)

طلوعِ اسلام اور حافظ عنایت اللہ اثری مرحوم (۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء)

ممتاز عالم دین اور طلوع اسلام کی طرح سر سید احمد کے افکار سے بہت متاثر ہیں جیسا کہ اثری کے لاحقہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ آپ خود کو اہلحدیث کہلوانا پسند فرماتے ہیں جبکہ جماعت اہلحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجرانوالہ کے دورِ نظامت میں) نے ایک دفعہ آپ کو جماعت سے خارج کرنے کی قرارداد بھی پیش کردی تھی جس پر بوجوہ عملدرآمد نہ ہو سکا۔

آپ بھی سر سید اور دوسرے تمام منکرین حدیث کی طرح معجزات انبیاء کے منکر ہیں۔ آپ نے تمام امت مسلمہ کے مسلمہ عقیدہ کے علی الرغم "عیون زمزم فی ولادت عیسیٰ ابن مریم" نامی کتاب لکھ کر حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدائش کی تردید فرمائی۔ علاوہ ازیں دو کتابیں بیان المختار اور قول المختار لکھ کر تمام انبیاء کے معجزات سے انکار فرمایا ہے۔ حافظ صاحب اور دوسرے منکرین حدیث میں مابہ الامتیاز فرق یہ ہے کہ تمام منکرین حدیث کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے احادیث کا انکار کرتے ہیں پھر بعد میں قرآن کی من مانی تاویلات کر کے قرآن پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ جبکہ حافظ صاحب تاویلات کے ذریعہ پہلے قرآن پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ بعدہٗ حدیث پر۔ گویا آپ کا کام عام منکرین حدیث سے دوگنا بڑھ گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاویل قرآنی کے دھندے میں حافظ صاحب موصوف نے منکرین حدیث کے کان کتر ڈالے ہیں۔ راقم الحروف نے مندرجہ بالا تینوں کتب کے جواب میں ایک مفصل کتاب "عقل پرستی اور انکار معجزات" لکھی ہے جس میں حافظ صاحب کی تاویلات وافکار کا مدلل طور پر محاسبہ پیش کیا گیا ہے۔

حافظ صاحب نے جب واقعہ اسراء کی تاویل پیش فرماتے ہوئے مسجد اقصیٰ سے مراد دور کی مسجد اور مدینہ منورہ نیز واقعہ اسراء سے مراد ہجرت نبوی کا تصور پیش کیا تو پرویز صاحب نے انہیں درج ذیل الفاظ میں ہدیہ تبریک پیش فرمایا تھا۔

" اگلے دنوں ایک صاحب کی وساطت سے مجھے عنایت اللہ اثری (وزیر آباد، ضلع گجرات) کی کتاب حصول تیسیر البیان۔ علی اصول تفسیر القرآن دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ انہوں نے بھی مسجد اقصیٰ کا وہی مفہوم لیا ہے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا تھا۔ ایک اہل حدیث عالم کی طرف سے اس آیت کا وہ مفہوم جو روایاتی مفہوم سے ہٹا ہوا ہو۔ واقعی باعث تعجب (اور چونکہ وہ مفہوم میرے نزدیک قرآن کے منشار کے مطابق ہے اس لیے وجہ حیرت ہے) مولانا صاحب اگر بقید حیات ہوں (خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور خدا ان کی عمر دراز کرے) تو وہ میری طرف سے اس تحقیق اور حق گوئی کی جرأت پر ہدیہ تبریک قبول

فرمائیں:" (طلوع اسلام جنوری ۱۹۵۸ء ص ۱۷)

اور اب جب طلوعِ اسلام کا دور آیا تو زمانے کے تقاضے اور آگے بڑھ چکے تھے، تہذیبِ مغرب کی تقلید میں ہمارے ہاں بھی "مساواتِ مرد و زن" کے نعرے لگ رہے تھے حقوقِ نسواں کمیٹیاں مقرر ہو چکی تھیں، ان کے عالمی سال منائے جا رہے تھے۔ عورتیں ہر طرح کے سیاسی اور معاشی حقوق مانگ رہی تھیں اور وہ عائلی نظام میں کسی طرح بھی ثانوی حیثیت سے رہنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ تعددِ ازواج کا مسئلہ پہلے ہی سرسید احمد خاں صاحب حل فرما چکے تھے[1]۔ پرویز صاحب نے اس نوعیت کے مسائل پر قلم اٹھایا اور اپنے قرآنی فکر کی رُو سے طاہرہ کے نام خطوط لکھ کر عائلی نظام میں مرد کے تفوق یا سربراہِ خانہ کی حیثیت کو حتی الامکان ختم کر دیا۔

ادھر روس میں اشتراکیت قائم ہوئے تیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے نعرے لگ رہے تھے اور بعض علماء اشتراکیت کے حق میں قرآن سے دلائل بھی پیش کر رہے تھے۔ آپ ذہنی طور پر اشتراکیت کے نظام کو پسند کرتے تھے۔ لہٰذا آپ نے انسان کے معاشی مسئلہ کا حل قرآنی نظامِ ربوبیت کی شکل میں پیش کیا جو اپنی ظاہری شکل و صورت میں اشتراکیت کا مکمل چربہ ہے جس میں انفرادی ملکیت کو کلیۃً ختم کر دیا گیا ہے مگر اس کا بنیادی فلسفہ صرف خدا سے انکار اور لادینیت پر مبنی نہیں، بلکہ نظریۂ ارتقاء کے فلسفہ پر مبنی ہے جس کی رُو سے انسان کا محض معاشی مسئلہ ہی حل نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتی ہے جو آپ کے قرآنی فکر کی رُو سے انسان کا منتہائے مقصود یا مقصدِ حیات ہے۔

طلوعِ اسلام کے عجمی افکار

گویا ادارہ طلوعِ اسلام نے سابقہ قرآنی فکر کو صرف آگے ہی نہیں بڑھایا، بلکہ اس فکر کے لیے مزید میدان بھی پیدا کیے ہیں جن کو مختصراً درج ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] سرسید ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کے جواز کے قائل نہیں، دلیل یہ دی ہے کہ قرآن نے اس کیلئے عدل کی شرط عائد کی ہے اور ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر تم چاہو بھی تو ان کے درمیان عدل نہیں کر سکو گے لہٰذا قرآن ہی کی رُو سے ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح جائز نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر بات یہی تھی جو سرسید سمجھے تو قرآن نے دو دو، تین تین اور چار چار بیویوں کی اجازت دے کر کیا محض شاعری ہی فرمائی ہے۔

۱۔ عقل کا تفوق اور برتری :

یہی چیز فکرِ قرآنی کی رُوحِ رواں ہے جو جہم و اعتزال سے لے کر آج تک اس سلسلہ میں پائی جاتی ہے اور طلوعِ اسلام کی بیشتر کتابوں میں اس کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ہر چند یہ لوگ زبانی طور پر عقل کے مقابلہ میں وحی کی برتری کے قائل ہیں، لیکن عملاً جب یہ لوگ اپنے کسی مخصوص نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش میں تاویلات پیش کرتے ہیں تو ان کے زبانی اقرار کی نفی از خود ثابت ہو جاتی ہے۔

۲۔ خدا کی ذات کے متعلق ان لوگوں کا تصور تجریدی ہی رہا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے "ایمان بالغیب") تجریدی تصور کی یہ جھلک آپ کی بہت سی تصنیفات میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

۳۔ مسئلہ تقدیر اور جزا و سزا کے متعلق بھی آپ کا نظریہ معتزلین سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ آپ نے کتاب التقدیر لکھ کر اس مسئلہ کی یوں وضاحت فرمائی ہے کہ :

"خدا نے کائنات کو پیدا کر کے ہر چیز کے پیمانے یا قوانین مقرر فرما دیے ہیں، اب وہ خود بھی ان قوانین کا پابند بن گیا ہے، ہر عمل کا ایک لازمی نتیجہ ہے، جو ان قوانین کے تحت ظہور میں آتا ہے اور ان نتائج کو روکنا یا ختم کرنا اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے جہاں انسان کو اپنے اعمال کا مختارِ کلی قرار دیا گیا ہے۔ وہاں خدا کی مغفرت اور انبیاء و صالحین کی شفاعت کا عقیدہ بھی باطل قرار پاتا ہے۔"

۴۔ معجزات کے انکار کے سلسلہ میں آپ سر سید کے ہمنوا ہیں اور کوئی بات خلافِ فطرت تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ سر سید گو زبانی طور پر معجزہ کے امکان کے قائل ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے قرآن میں مذکور تمام معجزات کی ایسی تاویل فرمائی ہے کہ ہر واقعہ کو مطابقِ فطرت بنا کے چھوڑا ہے۔ پرویز صاحب بھی دبی زبان میں عصائے کلیمی کے اعجاز کے قائل ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ :

"وہ دور ہی اعجوبہ پرستی کا تھا، نیز ذہن انسانی ابھی ناپختہ تھا، لہٰذا انہیں یہ معجزہ دیا گیا۔ حضورِ اکرم ﷺ کے دور میں انسانی عقل و فکر اپنی پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا آپ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ قرآن کریم سے حضور اکرم ﷺ کا کوئی حسی معجزہ[1] ثابت نہیں ہوتا۔" (معراج انسانیت ص ۲۰۳)

---

[1] حالانکہ قرآن سے آپ کے کم از کم تین حسی معجزے ثابت ہیں، جن کی تفصیل پہلے پیش کی جا چکی ہے۔

مگر عملاً وہی کچھ کرتے ہیں جو سرسید نے کیا:

۵۔ نظریہ ارتقاء کے مسئلہ میں آپ صرف سرسید کے ہمنوا ہی نہیں، بلکہ "ابلیس و آدم" نامی کتاب لکھ کر اس نظریہ کو قرآن سے ثابت کیا ہے۔ ملائکہ، آدم، ابلیس وغیرہ سب باتوں میں آپ سرسید کی توجیہات کو تسلیم کرتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ آپ نے انسان کے آئندہ ارتقاء کی بھی نشاندہی فرمائی ہے۔ یہ بحث آگے آتے گی۔

۶۔ آپ نے حافظ اسلم کے پیش کردہ تصور مرکز ملت کی بھی قرآن کریم سے توضیح و تصریح فرمائی ہے جس کی رُو سے آپ نے مرکز ملت کو اللہ اور رسول کے جملہ اختیاراتِ تشریع تفویض فرما دیے ہیں۔

۷۔ "طاہرہ کے نام خطوط" لکھ کر آپ نے عائلی نظام میں مرد کے تفوق کو یکسر ختم کر دیا ہے اور یہ سب کچھ قرآن کریم سے ہی ثابت کیا گیا ہے۔

۸۔ آپ کی سب سے نمایاں کارکردگی یہ ہے کہ آپ نے انسان کے معاشی مسئلہ کا حل قرآنی نظام ربوبیت کی شکل میں قرآن ہی سے ثابت کر دکھایا ہے۔

تاویلات کا دھندا:

اب ظاہر ہے کہ اتنے کثیر جمیع نظریات کو قرآن سے ثابت کرنے کے لیے قرآن کی کس قدر آیات کو تاویلات کی سان پر چڑھانا ضروری تھا اور ساتھ ہی متعلقہ احادیث سے انکار بھی، لہٰذا آپ نے ان دو گونہ پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے:

۱۔ تمام احادیث کو ناقابلِ اعتماد قرار دیا، آپ صرف وہ احادیث قابلِ قبول سمجھتے ہیں جو آپ کی "قرآنی فکر" کے مطابق ہوں۔

۲۔ قرآن کی تمام مروجہ اصطلاحوں کو نئے معانی و مفاہیم کا جامہ پہنایا، مثلاً خدا، عبادت، اسلام، ملائکہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، قیامت، جنت، دوزخ، ایمان بالغیب وغیرہ کا مروجہ مفہوم ہی یکسر بدل ڈالا گیا، پھر بھی بات نہ بنی تو کئی جلدوں میں لغات القرآن تصنیف کر ڈالی گئی اور دورِ جاہلیت سے عربی الفاظ کے ایسے معانی تلاش کیے گئے جو ان مخصوص نظریات کی تائید میں ممد ثابت ہو سکیں۔

طلوعِ اسلام کا لٹریچر:

پھر چونکہ آپ کا یہ اندازِ تفسیر بالکل نرالا تھا، لہٰذا آپ کو اسے عام لوگوں کو سمجھانے کے لیے لغات القرآن، مطالب الفرقان، معارف القرآن، مفہوم القرآن اور تبویب القرآن کی کئی کئی جلدیں مرتب کرنا پڑیں، اس سے بھی کام نہ چلا تو کثیر مقدار میں اردو لٹریچر کا بھی اہتمام کیا گیا تاکہ

عوام الناس قرآن کے معنی ومطالب اسی طرح سمجھ سکیں جس طرح آپ خود اسی قرآنی بصیرت کے مطابق اسے سمجھے ہیں۔

ایک لطیفہ یاد آگیا، پرویز صاحب نے "قرآنی فیصلے" ص ۲۴۰ پر ایک ہندو کا خط نقل فرمایا ہے۔ جو لکھتا ہے کہ آپ نے جو میرے مطالعہ کے لیے قرآن مترجم بھیجا ہے' یہ بیشتر مقامات پر اپنے معانی میں صاف ہے اور اس سے سرورح کو تسکین ہوتی ہے لیکن اس کی شرح و تفسیر میں پورا "صندوق کتب" موجود ہے۔ میں اس مطالعہ کا بار نہیں اٹھا سکتا" پرویز صاحب نے واقعی اس "صندوق کتب" کے بارے ہری چند مہاشا کو نجات دے دی۔ لیکن قرآن کی تفہیم وتشریح کے لیے اس سے بڑا صندوق کتب خود تیار کر دیا ہے، گویا آپ کو اصل شکایت یہ ہے کہ مسلمان احادیث وتفاسیر کا بوجھ کیوں اٹھاتے ہیں۔ میری تصنیف شدہ کتب کا بوجھ کیوں نہیں اٹھاتے؟ رہا عوام کا مسئلہ تو انہیں تو بہر حال کوئی نہ کوئی بوجھ اٹھانا ہی پڑے گا۔

آپ کی اس تاویل وتفسیر پر کسی دل جلے نے یوں تبصرہ کیا،

"آپ کے مشورہ پر معارف القرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر اس کی تو پہلی ہی جلد نے میرا جی جلا دیا غضب خدا کا تفسیر بالرائے کی ایسی بھونڈی مثالیں نہ کبھی دیکھیں نہ سنیں، چلتے چلتے ایک لفظ کی طرف اشارہ کرتا ہوں، سن لیجیے کہ آپ کے پرویز صاحب کیسے کیسے حیلوں سے تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ ایک لفظ ہے "آلاء" جو سورۃ رحمٰن میں تکرار کے ساتھ استعمال ہوا ہے سلف سے لے کر خلف تک سب مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس کے معنی نعمت ہیں، مگر وہ (پرویز صاحب) اس کے معنی "قدرت" کر دیتے ہیں۔ اب کہیے کہ ایسی تفسیر کو اگر جائز رکھا جائے تو قرآن بچوں کا کھیل بن جاتا ہے یا نہیں کہ جو آئے اسے مروڑ دے"!

("جناب پرویز کے معتقد خاص سید نصیر شاہ کے نام ایک کرم فرما کا خط" بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام جون ۱۹۵۸ء)

مسلمانوں سے شکوہ؟:

۔ آپ چونکہ مغربی افکار ونظریات سے شدید متاثر ہیں اور اپنی قرآنی تاویل وتعبیر کی تائید میں بسا اوقات مغربی مفکرین کے اقتباسات ہی پیش فرماتے ہیں۔ لہٰذا اس طرزِ عمل کے دو نتائج بدیہی طور پر سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی یہ تاویل وتعبیر کم از کم مسلمانوں میں نہیں پنپ سکتی۔ اس بات کا شکوہ آپ خود بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم چونکہ قرآن کو ترجموں کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس کی اصل سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن سمجھنے کے لیے عربی جان

نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور جب تک ہم عربی نہ جانیں قرآن کو کیسے سمجھ سکتے ہیں لیکن اس سے اس مشکل کا حل نہیں ہوتا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جن حضرات نے عربی ترجمے کیے ہیں وہ تو عربی جانتے تھے۔ اگر عربی جاننے سے صحیح قرآن سمجھ میں آ جاتا تو ان کے ترجموں سے بھی قرآن سمجھ میں آ جانا چاہیے تھا۔ تمام تر نہیں تو قریب قریب۔ دوسری چیز یہ (اور یہ پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے) کہ آج مسلمانانِ عالم کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جس کی مادری زبان عربی ہے۔ ان کے لیے صحیح قرآن سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی قریب قریب اسی قسم کا قرآن سمجھتے ہیں جس قسم کا قرآن ہمارے ہاں ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ آپ عربی ممالک (یعنی عربی بولنے والے مصنفین) کی مذہبی کتابیں اٹھا کر دیکھیے، جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، ان میں اور اپنے ہاں کی مذہبی کتابوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ مجھے ایک عرب ادیب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، ادب کا امام، زبان پر اس قدر عبور کہ ایک ایک لفظ کی بیسیوں سندات مستحضر۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اسے بڑے بڑے عربی لغت، شعرا کے دواوین اور کتبِ محاضرات حفظ یاد ہیں۔ مرادفات کے معنی میں ایسا لطیف فرق بتاتا تھا کہ سُن کر لطف آ جاتا تھا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی، جب میں دیکھتا کہ جونہی قرآن کی کوئی آیت سامنے آتی وہ وہی مفہوم بیان کرتا جو ہمارے مکتبوں میں پڑھایا جاتا ہے اور جس میں قرآنی[1] نظام کو نہیں ہوتا۔" (قرآنی فیصلے ص ۲۶۰، ۲۶۱)

اہلِ مغرب میں پرویز صاحب کی مقبولیت:۔

اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی یہ تاویل و تعبیر اہلِ مغرب نے اسلام دشمنی کی بنا پر پسند فرمانا شروع کر دی۔ کیونکہ ان کا کام اگر کوئی مسلمان ہی سرانجام دینا شروع کر دے تو ان کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی؟ چنانچہ درج ذیل اقتباسات میں آپ اس حقیقت کا اعتراف یُوں فرما رہے ہیں:۔

۱۔ "میرا اندازہ ہے کہ قرآنِ کریم (یعنی آپ کی قرآنی بصیرت کو) سمجھیں گے تو مغرب کے منکرین سمجھیں گے" (سلیم کے نام سولھواں خط ص ۲۷۷)

۲۔ "مجھے مغربی قوموں کی سرزمین قرآنی پیغام کے لیے زیادہ سازگار معلوم ہوتی ہے، کیونکہ

---

[1] یعنی پرویز صاحب کی قرآنی نظام کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔

وہاں "عقل" ہے۔ ملازم کی جہالت اور تنگ نظری نہیں ہے ..... میرا اندازہ ہے کہ مسلمانوں کی نسبت مغربی اقوام کے غیر مسلم قرآن کی آواز کو زیادہ توجہ سے سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ جو کچھ ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے اسے کس طرح چھوڑ دیا جائے؟" (سلیم کے نام سترھواں خط ص ۳۰۷)

گویا آپ کے خیال میں سارا قصور تنگ نظر ملا کا ہے۔ جو عقل سے عاری ہے اور آپ کی تاویل و تعبیر کی ہمنوائی سے قاصر ہے۔ رہا آپ کا تفسیری کارنامہ تو اسے آپ قرآن کی طرح ہی شک و شبہ سے بالاتر سمجھتے ہیں

ایک تیسرے مقام پر فرماتے ہیں:

۳۔ "اس سے بھی بڑھ کر خوشی کا یہ مقام ہے کہ یہ آواز اب پاکستان کی حدود سے آگے نکل کر مغربی ممالک میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔ پچھلے سال میں نے آپ احباب سے ذکر کیا تھا کہ کس طرح ایک جرمن مصنف نے اپنی پاکستانی سیاحت کی روئداد کے سلسلہ میں یہ لکھا تھا کہ یہاں ایک ہی تحریک قابلِ ذکر ہے اور وہ طلوع اسلام کی تحریک ہے۔ اب حال ہی میں ایک کتاب ہالینڈ سے شائع ہوئی ہے، کتاب کا نام (Modern Muslim Koran Interpretation) اور مصنف کا نام ہے (J.M.S. Balion)۔ اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں قرآن کی جدید تعبیرات کی کوششیں کہاں کہاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے پاکستان سے صرف دو مصنفوں کو منتخب کیا ہے۔ ایک علامہ مشرقی اور دوسرے آپ کا یہ رفیق (یعنی پرویز صاحب) اس نے سلسلہ معارف القرآن اور سلیم کے نام خطوط وغیرہ کا براہِ راست اردو سے مطالعہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں ان کے اقتباس پر اقتباس دیے چلا جاتا ہے۔"

(پرویز صاحب کا خطاب طلوع اسلام کنونشن بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام مئی جون ۱۹۶۳ء)

اور یہی بات ہم کہتے ہیں کہ پرویز صاحب قرآن کریم سے خود کچھ سمجھنے کی بجائے عجمی افکار و نظریات کو قرآن کے منہ میں ڈالنا اور اہل مغرب کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ گو صوفیہ کی طرح ان کا بھی یہی دعویٰ ہی ہے کہ وہ وحی کے تابع [illegible] خالی الذہن ہو کر قرآن کریم میں غور و خوض فرماتے [illegible]

[illegible] فرمایئے

ہماری مطبوعات

مرآۃ القرآن

(حافظ عبدالحی صاحب) قرآن کریم کی مستند اردو لغت جس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں :-

۱۔ قرآن کریم میں کوئی ایک لفظ جتنے معانی میں استعمال ہوا ہے اس کی تفصیل۔
۲۔ ہر لفظ یا آیت کے ٹکڑے کے سامنے سورت اور آیت کا نمبر درج ہے۔
۳۔ ہر مادہ کے تحت قرآن میں استعمال شدہ تمام مشتقات کا تفصیلی ذکر۔
۴۔ ہر مشتق لفظ کے باب اور فعل کی داہنی طرف کے نمبروں کے ذریعہ وضاحت۔ ان نمبروں کی وضاحت کے لیے ابتدا میں جدول دیا گیا ہے۔
۵۔ ہر مادہ کے آخر میں اس کے متعلقات پر لغوی بحث بھی گئی ہے۔

سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات اندازاً ۵۰۰ قیمت مجلد ۸۰/- روپے

آئینہ پرویزیت

(عبدالرحمن کیلانی) اس ضخیم کتاب کے درجِ ذیل ۶ حصے ہیں :-

۱۔ معتزلہ سے طلوعِ اسلام تک۔ اس حصہ میں اس فرقہ کی ابتدا، ارتقاء اور عقائد میں تدریجی تبدیلی کا ذکر ہے۔ صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۲/- روپے
۲۔ طلوعِ اسلام کے مخصوص نظریات۔ مثلاً حسبنا کتاب اللہ، عجمی سازش، مساواتِ مرد و زن، مسئلہ ارتقاء، مرکزِ ملت اور نظامِ ربوبیت وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ صفحات ۲۰۸ قیمت ۲۱/- روپے سائز ۱۸×۲۳/۸
۳۔ قرآنی مسائل بجواب قرآنی فیصلے۔ اس میں درجِ ذیل مسائل زیر بحث آئے ہیں: قرآنی نماز، قرآنی زکوٰۃ، قربانی، اطاعت والدین۔ ناسخ و منسوخ، عذابِ قبر، وصیت، یتیم پوتے کی وراثت، تلاوتِ قرآنِ پاک، نکاحِ نابالغاں، تعددِ ازواج، غلام اور لونڈیاں، رجم اور حدِ رجم۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۵/- روپے
۴۔ دوامِ حدیث۔ علم حدیث کے اصولی مباحث پر منکرینِ حدیث کی طرف سے وارد کئے گئے اعتراضات کے مسکت جواب صفحات ۱۹۲ قیمت ۲۰/- روپے
۵۔ دفاعِ حدیث۔ حدیث کے داخلی مواد پر منکرینِ حدیث کی طرف سے وارد کئے گئے اعتراضات کے مسکت جواب۔ صفحات ۱۲۶ قیمت ۱۸/- روپے
۶۔ طلوعِ اسلام کا اسلام۔ اس حصہ میں طلوعِ اسلام کے لٹریچر کے حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انکارِ حدیث کے بعد منکرینِ حدیث کا اعتقاداً یا عملاً اس اسلام سے کوئی تعلق نہیں رہتا جو کتاب و سنت میں مذکور ہے صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۵/- روپے

مکمل ۶ حصے ایک جلد میں ۹۸۴ صفحات ۱۸×۲۳/۸ قیمت مجلد ۱۰۰ روپے

عقل پرستی اور انکارِ معجزات

(عبدالرحمن کیلانی) قرآن کریم میں انبیاء کے بیسیوں معجزات مذکور ہیں جن کی مزید تفصیل احادیث میں ملتی ہے۔ لیکن عقل کے پرستار خرقِ عادت باتوں کو تسلیم کرنے کی بجائے ان کی نہایت مضحکہ خیز تاویلات پیش کرنے لگ جاتے ہیں۔ سب سے پہلے معتزلہ نے عقل کی برتری کو بطور عقیدہ تسلیم کیا پھر احادیث کی حجیت سے یکسر انکار کر دیا اور قرآن کی من مانی تاویلات پیش کیں۔ ہند میں سر سید احمد خاں نے ان عقائد کی آبیاری کی جنہیں طلوعِ اسلام نے پروان چڑھایا۔ حافظ عنایت اللہ اثری سر سید مرحوم سے سخت متاثر تھے چنانچہ انہوں نے عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش سے تو یکسر انکار کر دیا اور باقی معجزات اور خرقِ عادت باتوں کی بے ہنگم تاویلات پیش کیں۔ کتاب ہذا میں انہی کے عقائد پر گرفت کی گئی ہے۔

سائز ۲۰×۲۶/۸ تقریباً ساڑھے تین صد صفحات رعایتی قیمت ۲۵/- روپے

خلافت و جمہوریت

(عبدالرحمن کیلانی) مغربی جمہوریت عصرِ حاضر کا سب ... جسے توڑے بغیر اقامتِ دین کا فریضہ بجا لانا ممکن نہیں ... یہ ہے کہ ہم نفاذِ اسلام کی نیک آرزوؤں کے ساتھ ساتھ اس جمہوریت کو بھی گلے لگانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں کتاب و سنت کے دلائل سے یہ ثابت ... کہ اسلام اور مغربی جمہوریت یکسر دو متضاد و متصادم چیزیں ہیں جن میں سمجھوتہ نا ...

دوسرا ایڈیشن ۱۸×۲۳/۸ ۲۸۸ صفحات مجلد سنہری ڈائی قیمت ۳۶ ...

روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ

(عبدالرحمن کیلانی) متعلقہ موضوع پر نہایت ... اور معلوماتی کتاب۔ یہ کتاب دراصل ... طویل مضامین کا مجموعہ ہے جو مستفسرین کے جوابات کی صورت میں لکھے گئے اور مجلہ ترجمان ... اور محدث میں چھپتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں متعلقہ موضوعات سے متعلق مختلف ... فکر کے افکار و نظریات کا بھرپور اور مدلل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۱۵۲، سفید کاغذ، قیمت ...

اسلام میں ضابطہ تجارت

(عبدالرحمن کیلانی) آج کے دور میں ... معاملات میں بیشمار ایسے امور داخل ہو گئے ہیں ... ناجائز ہیں، مگر ان کا عام لوگوں کو پتہ ہی نہیں۔ اس کتاب میں اکلِ حلال کی اہمیت پر روشنی ... کے بعد تجارت کی سب جائز اور ناجائز صورتوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر ضمناً ... رہن، قرضہ، دیوالیہ، ضمانت اور زکوٰۃ کے اہم اور موجودہ مسائل پر بھی بحث آ گئی ...

سائز ۱۸×۲۳/۸، صفحات ۱۴۸، سفید کاغذ، قیمت ۹/- روپے

احکامِ ستر و حجاب

(عبدالرحمن کیلانی) اس کتاب میں درجِ ذیل عنوانات زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ تہذیبِ حاضر کا پس منظر ... نتائج، ستر و حجاب کا فرق۔ احکامِ حجاب پر احوال و ظروف کی اثر اندازی۔ احکام کی ترتیبِ نزولی۔ چہرہ اور ہاتھوں کا پردہ؟ قائلین اور منکرینِ حجاب کے دلائل۔ مشہور ... کے نامور محدث ناصر الالبانی صاحب کا موقف۔ پردہ پر مستشرقین کے اعتراضات کا ...

سائز ۱۸×۲۳/۸ صفحات ۸۸ قیمت ۹/- روپے

صنعت و تجارت کی زکوٰۃ

(تحریر عربی، ڈاکٹر یوسف قاسم ترجمہ عبدالرحمن ...) اس کتاب میں اموالِ صنعت و تجارت ... تعیین اور سعودی عرب میں اس کے نفاذ کے طریقِ کار کی تفصیل دی گئی ہے

سائز ۱۸×۲۳/۸ صفحات ۷۲ قیمت ۹/- روپے۔

قرآن نافہمی کے اسباب اور اس کا حل

موضوع متعلقہ پر ایک جامع اور ... افروز پمفلٹ جو کئی مرتبہ چھپ چکا ... چھوٹا سائز ۳۲ صفحات سفید کاغذ قیمت ...

زیرِ طبع کتب ـ (از عبدالرحمن کیلانی)

۱۔ مترادفات القرآن :- جس میں قرآن میں مستعمل مترادف الفاظ ... کتبِ لغت کے حوالوں اور قرآنی آیات ک ...

۲۔ شریعت و طریقت :- اس کتاب ... کب اور کیسے ہوا، اور آج تک ... اسلام صوفیاء کے ذریعہ آیا یا اس سے پہلے بھی موجود ... میں جو اسلام پھیلا یا وہ کیسا اسلام تھا۔

مکتبۃ السلام ۔ وسن پورہ گلی نمبر ۲ ۔ لاہور